از

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

ایم - اے، پی ایچ - ڈی

صدر شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی

اردو اکیڈمی سندھ کراچی

پہلی بار .... نومبر ۱۹۵۷ء

مطبوعہ .... نشاط پریس کراچی

قیمت

پانچ روپیہ

پنجاب آفس

اردو مرکز

گنپت روڈ۔ لاہور

نظیر اکبر آبادی

(الف) ان کا عہد اور شاعری

(ب) انتخاب

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

نظیر اکبر آبادی ان کا عہد اور شاعری

نظیر کی شاعری اور ان کی شخصیت ایک معمہ ہے۔ بعض لوگ انہیں اوباش، آوارہ اور بد اطوار اور ان کے کلام کو عامیانہ، مبتذل، فحش اور رکیک سمجھتے ہیں۔ بعض دوسروں کے نزدیک وہ صرف خوش باش تھے اور یہی خوش باشی ان کے کلام کا اصلی جوہر ہے۔ یہی جہاں زیادہ شوخ ہو جاتی ہے وہاں طبع نازک پر گراں گزرنے لگتی ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو نظیر کو صفت اول کے شعراء کی فہرست میں رکھنے میں تامل کرتے ہیں اور بعض انہیں شاعر اعظم بتاتے ہیں۔ یہی نظیر کہیں صوفی، کہیں رند مشرب، کہیں واعظ اور کہیں امرد پرست نظر آتے ہیں۔ ان کی اخلاقی نظموں کو پڑھ کر روشن چہرہ اور نورانی ڈاڑھی کا تصور بندھتا ہے اور گلہری کا بچہ پڑھ کر وہ نظیر سامنے آ جاتے ہیں جو ہاتھ میں کڑا اور ڈنڈا لئے آزاد فقیروں کی وضع بنائے سکسینہ کی تاریخ والی کتاب میں آپ کو ملتے ہیں—آخر نظیر کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے۔

قدرتی طور پر سب سے پہلے ہمارے سامنے نظیر کے ماحول اور زمانہ کا مسئلہ آتا ہے۔ ان کی وفات آج سے تقریباً سوا سو سال پہلے یعنی ۱۲۶۴ھ میں (۱۶ اگست ۱۸۳۰ء) ہوئی۔ عمر خاصی پائی تھی اس لئے کم و بیش اس سے پہلے سو سال کا زمانہ اس میں اور شامل کرنا چاہئے۔ ولادت کی صحیح تاریخ کا اب تک تعین نہیں ہوا لیکن بعض روایات کے مطابق محمد شاہ ثانی کے عہد میں نادری حملہ کے قریب کسی سال میں قرار پاتی ہے۔ یہ زمانہ سیاسی معاشی

اور ذھنی اعتبار سے ایک تکلیف دہ، سست رفتار، انتشار اور زول کا دور ھے ۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے پہلے ھی مغلیہ سلطنت میں زوال کے اثار پیدا ھو چلے تھے، اس کے عہد میں دکن کی مسلسل فوج کشی نے خزانے خالی کر دئے ۔ معاشی اعتبار سے یہ دھکا لگا ۔ لیکن اس سے بڑھ کر یہ ھوا کہ میدان جنگ میں کام آنے والے ھزاروں بہادر سپاھیوں اور افسروں کے نقصان سے جو خلا پیدا ھوا وہ پھر کبھی پر نہ ھو سکا ۔ اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ سکھوں، جاٹوں، مرھٹوں نے چاروں طرف سے یورش کی، نادری حملہ تو ایک بڑا حادثہ تھا ایسے چھوٹے موٹے حادثے روز پیش آتے رھتے تھے اور لوگوں کو جان بچانے یا گوشہ امن و عافیت تلاش کرنے کی فکر ھر وقت دامن گیر رھتی تھی ۔ ان حالات میں معاشی فارغ البالی کا تصور کہاں سے آ سکتا ھے ۔ عوام کے معاش کے چند مخصوص سہارے تھے، تجارت، سپاہ گری اور نوکری، تجارت اس سیاسی خلفشار میں کیا پھل پھول سکتی تھی ۔ رھی سپاہ گری، اس کا یہ حال تھا کہ تنخواہ درکنار لڑنے والوں کو مناسب ساز و سامان بھی میسر نہ آتا تھا ۔ گھوڑے تھے تو ایسے جن کی شان میں سودا کا قصیدہ موجود ھے، اور سوار تھے تو ایسے کہ جوتا بغل میں مار میدان جنگ سے سید ھے گھر کا رخ کرتے تھے ۔ نوکری کسی رئیس یا امیر کے توسل سے حاصل ھوتی تھی ۔ اس طوائف الملوکی میں خود ان رئیسوں اور امیروں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا تو ان بیچارے متوسلین کو کون پوچھتا ۔ شاعر، ادیب اور فنکار نہ تو تجارت کر سکتے تھے نہ سپاھی بن سکتے تھے——————اس لئے ان پر قدرتی طور سے رزق کا دروازہ بالکل بند ھو چکا تھا ۔ میر تقی میر، مصحفی، انشا، جرأت، سب اسی گردش کے ستائے ھوئے ھیں ۔ لیکن جو بات زیادہ تکلیف دہ تھی وہ یہ کہ نااھلوں کو فروغ تھا اور جب یہ ارباب کمال رھنے کے لئے سر پر چھت کا سایہ اور کھانے کے لئے دو روٹی تلاش کرتے پھرتے تھے نا اھل قارون کے خزانے لٹا رھے تھے ۔ یہ حالات اورنگ زیب کی وفات سے شروع ھو کر تقریباً سو سال تک اسی طرح رھتے ھیں

اور ان کی گونج ان بے شمار شہر آشوبوں میں سنائی دیتی ہے جو حاتم، میر، سودا، مصحفی، اور میرحسن نے لکھے ہیں ۔نظیر نے ان حالات سے جو اثر قبول کیا ہے وہ پہلے ان کے شہر آشوبوں میں دیکھئے :—

ایک مخمس کا عنوان ہے، در بیان تماشائے دنیائے دوں، اس کے چند بند ملاحظہ ہوں :—

نہیں ہے زور جنہوں میں وہ کشتی لڑتے ہیں
جو زور والے ہیں وہ آپ سے پچھڑتے ہیں
چھپٹ کے اندھے بٹیروں کے تئیں پکڑتے ہیں
نکالے چھاتیاں کبڑے اکڑتے پھرتے ہیں
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے

بنا کے نیاریا زر کی دکان بیٹھا ہے
جو ہنڈی وال تھا وہ خاک چھان بیٹھا ہے
جو چور تھا سو وہ ہو پاسبان بیٹھا ہے
زمین پھرتی ہے اور آسمان بیٹھا ہے
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے

زباں ہے جس کی اشارے سے وہ پکارے ہے
جو گونگا ہے وہ کھڑا فارسی بھگارے ہے
کلاہ ہنس کی کوا کھڑا اتارے ہے
اچھل کے مینڈکی ہاتھی کے لات مارے ہے
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے

جو ہیں نجیب نسب کے وہ بندے چیلے ہیں
کمینے اپنی بڑی ذات کے نویلے ہیں
جو باز شکرے ہیں پاپڑ کھڑے وہ بیلے ہیں
بگھڑ تو مر گئے آلو شکار کھیلے ہیں
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے

جنہوں کی داڑھی ہے ان کی تو بات واہی ہے
جو داڑھی منڈے ہیں آن کی سند گواہی ہے
سیاہی روشنی اور روشنی سیاہی ہے
آجاڑ شہر میں مردوں کی بادشاہی ہے
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے

جنہوں کے کان نہیں دور کی وہ سنتے ہیں
جو کان والے ہیں بیٹھے وہ سر کو دھنتے ہیں
دھوئیں برستے ہیں اور ابر تنکے چنتے ہیں
کباب بھیگتے ہیں اور ملیدے بھنتے ہیں
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے

کھلے ہیں آک کے پھول اور گلاب جھڑتے ہیں
بنولے پکتے ہیں انگور آم سڑتے ہیں
سخی کریم پڑے ایڑیاں رگڑتے ہیں
بخیل موتیوں کو موسلوں سے چھڑتے ہیں
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشا ہے

نظیر کی یہ نوحہ خوانی کسی ایک سیاسی انقلاب یا حادثہ پر نہیں، ایک تہذیب اور ایک تمدن کے زوال پر ہے۔ نظیر کے سامنے وہ مثالی تہذیب و معاشرت ہے جہاں شرافت نسب کو بنیادی اہمیت تھی اور ان کے نزدیک زمانہ کی بدحالی کی ذمہ داری بڑی حد تک اس امر پر عائد ہوتی تھی کہ حکومت و سیاست اور عام زندگی میں ان لوگوں کا اقتدار بڑھ گیا جو کمینے اور چھچھورے تھے۔ جو لوگ اسلاف کے جانشین ہوئے ہیں ان کی مثال بقول نظیر ایسی ہی ہے کہ بگھڑ مر جائیں اور آلو شکار کھیلیں۔ پھر اس تہذیب و تمدن میں انسان کے ظاہر و باطن ایک ہونے پر بھی زور تھا۔ لوگ ظاہر کی اصلاح پر بھی توجہ کرتے تھے۔ پابندیٔ مذہب صرف زبان سے نہیں عمل اور وضع قطع سے ثابت کی جاتی تھی اسی لئے داڑھی والوں کی گواہی سند ہوتی تھی کہ احکامِ شریعت کا

بظاهر بھی پاس رکھتے ہیں۔ اب جو لوگ علی الاعلان ان احکام سے انحراف کرتے تھے انہیں کا سکہ چلتا تھا۔

اس زوال نے نیاریے کو زردار اور زردار کو محتاج بنا دیا۔ چور پاسبان بن بیٹھا اور پاسبان غالباً زندان میں پہنچ گئے۔ گونگے فارسی بگھارنے لگے اور زباندانوں کے دل کی بات دل میں رہ گئی یا زیادہ سے زیادہ اشاروں میں بات کرنے لگے۔ یہاں نظیر نے ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ اس دور کی شاعری میں جو رمزیت یا اشاریت پائی جاتی ہے اور جس کثرت سے اشاروں اور کنایوں کا استعمال ہوا ہے وہ براہ راست ان سیاسی اور ذہنی حالات کا نتیجہ ہے۔ غرض یہ انقلاب ایسا ہوا کہ نظام عالم بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ بقول نظیر زمین پھرتی ہے اور آسمان بیٹھا ہے' لیکن اس تضاد کو جس طنز کے انداز میں ان تین اشعار میں پیش کیا گیا ہے اس کا نمونہ شاید سودا کے یہاں کہیں نکل آئے تو نکل آئے اور کہیں مشکل سے ملے گا۔

دھوئیں برستے ہیں اور ابر تنکے چنتے ہیں
کباب بھیگتے ہیں اور ملیدے بھنتے ہیں
کھلے ہیں آک کے پھول اور گلاب جھڑتے ہیں
بنولے پکتے ہیں انگور آم سڑتے ہیں
سخی کریم پڑے ایڑیاں رگڑتے ہیں
بخیل موتیوں کو موسلوں سے چھڑتے ہیں

ایک اور مخمس جس کا عنوان شہر آشوب ہے خاص آگرہ کی معاشی ابتری کے حال میں نظم کیا ہے۔ اس شہر آشوب کی بنیاد بے روزگاری اور اس سے پیدا ہونے والی مفلسی پر ہے۔ اس بے روزگاری میں عالم جاھل، دانا، نادان، کاریگر اور اناڑی، شریف اور رذیل سب ایک ہی طرح مبتلا ہیں افسوس کہ اس شہر آشوب کی تصنیف کی قطعی تاریخ معلوم نہیں ورنہ شاید تاریخ کے مطالعہ سے کچھ اندازہ ہو سکتا کہ جس مفلسی اور بے روزگاری کی طرف نظیر نے

اشارہ کیا اس سے کن تاریخی واقعات کا پتہ چلتا ھے کیونکہ مخمس کا اندازہ ایسا ھے کہ اسے خالص شاعرانہ یا عمومی حالات پر ایک تبصرہ نہیں کہہ سکتے - معلوم ایسا ھوتا ھے کہ جو معاشی زبوں حالی آھستہ آھستہ طاری ھو رھی تھی وہ یکایک اپنی انتہا کو پہنچ گئی - بقول نظیر —ہ

ھر گھر میں اس طرح سے پھر آئی ھے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جائے ھے جوں ایک بار بند

جن لوگوں نے کسی سیلاب کی آمد اور اس کی تباہ کاریوں کا مشاھدہ کیا ھے وہ نظیر کی اس تشبیہ سے پوری طرح لطف اندوز ھو سکتے ھیں - جب بند ٹوٹ کر طوفان پھیلنے لگتا ھے تو اس کی زد میں جو چیز بھی آئے بلا استثنا بہتی چلی جاتی ھے - اس انقلاب نے بھی سوسائٹی کے ھر طبقہ کو ھلا دیا - اس کی تفصیلات **نظیر** نے بڑی خوبی سے بیان کی ھیں - ان سے ضمنی طور پر ان تمام صنعتوں اور پیشوں کا بھی حال معلوم ھو جاتا ھے جو اس عہد میں مختلف لوگ اختیار کرتے تھے - **نظیر** کا یہ بیان طویل سہی اس کے دلچسپ اور عبرت آموز ھونے میں شبہ نہیں -

ھے اب تو کچھ سخن کا میرے کاروبار بند
رھتی ھے طبع سوچ میں لیل و نہار بند
دریا سخن کی فکر کا ھے موج دار بند
ھو کس طرح نہ منہ میں زباں بار بار بند
جب آگرے کی خلق کا ھو روزگار بند

کڑیاں جو سال کی تھیں بکیں وہ تو اگلے سال
ناچار قرض دام سے چھپر لئے ھیں ڈال
پھونس اور ٹھٹھیرے اسکے ھیں جوں سر کے بکھرے بال
اس بکھرے پھونس سے ھے یہ ان چھپرونکا حال
گویا کہ ان کے بھول گئے ھیں چمار بند

نظیر کی تشبیہات میں جو جدت، ندرت اور جانداری ہوتی ہے وہ اس بند میں موجود ہے۔ بالوں کی تشبیہات میں ہمارے جدید و قدیم شعرا نے مارسیہ اور سنبل سے لے کر شب فراق کے طول تک کے ہزاروں مضامین پیدا کئے لیکن بکھرے ہوئے بالوں سے ایک بوسیدہ اور منتشر چھپر کے پھوس کی کیفیت جس خوبی سے ظاہر ہے وہ نظیر اپچ کی ایک مثال ہے۔

کپڑا نہ گٹھڑی بیچ نہ تھیلی میں زر رہا
خطرہ نہ چور کا نہ اچکے کا ڈر رہا
رہنے کو بن کواڑ کا پھوٹا کھنڈر رہا
کھنکھار جاگنے کا نہ مطلق اثر رہا
آنے سے بھی جو ہو گئے چور و چکار بند

جن لوگوں نے قدیم شاندار عمارات کے بلند و بالا پھاٹک دیکھے ہیں وہ مکین کی مفلسی کا اندازہ اس ٹوٹے کھنڈر سے کر سکتے ہیں جس کے کواڑ بھی مفلسی کی نذر ہو چکے ہوں۔

اب آگرے میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ
آتا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ
مانگو عزیزو ایسے برے وقت سے پناہ
وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج اب ہیں آہ
کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند
صراف، بنئے، جوہری اور سیٹھ ساہوکار
دیتے تھے سب کو نقد سو کھاتے ہیں اب ادھار
بازار میں اُڑے ہے پڑی خاک بے شمار
بیٹھے ہیں یوں دوکانوں پہ اپنی دوکان دار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند
مارے ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار
اور جتنے پیشہ دار ہیں روتے ہیں زار زار

کوٹے ہے تن لوہار تو پیٹے ہے سر سنار
کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشہ والوں کے ہیں کاروبار بند

جن چھتیس پیشہ والوں کی طرف **نظیر** نے یہاں اشارہ کیا ہے اُن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:—

(۱) زردار (۲) بٹئے (۳) تارکش (۴) بساطی (۵) نانبائی (۶) بھڑبھونجے (۷) دھنئے (۸) جولاہے (۹) کاغذی (۱۰) بیوپاری (۱۱) کوتوال (۱۲) چوکیدار (۱۳) ملاح (۱۴) کمان گر (۱۵) صحاف (۱۶) مصور (۱۷) نقاش (۱۸) حجام (۱۹) خدام (۲۰) بامھن (برھمن) (۲۱) صراف (۲۲) بنیہ (۲۳) جوھری (۲۴) ساھوکار (۲۵) پنساری (۲۶) دلال (۲۷) سپاھی (۲۸) ملا۔

معلوم نہیں ان کے علاوہ چھتیس پیشہ داروں میں اور کون لوگ شامل تھے جن کی تباہ حالی کا رونا **نظیر** نے رویا ہے۔ اس سے پہلے جو شہر آشوب لکھے گئے تھے ان کے انقلاب زمانہ کا ذکر ایسے انداز میں ہوتا گویا شریف گردی اور سلفہ نوازی کا شکوہ کیا گیا ہے۔ نا اھلوں کے فروغ، شریفوں کے زوال اور ارباب علم و فن کی کس مپرسی پر شاعروں نے بے اختیار نوحہ کیا ہے لیکن یہ شہر آشوب اس اعتبار سے نہایت اھم ہے کہ اس میں متوسط طبقہ اور خاص طور پر دستکاروں اور پیشہ وروں کی تباہ حالی کا بیان ہے جس سے معلرم ہوتا ہے کہ یہ تباھی واقعی ایسی تھی جس سے زیادہ آلام اور مصائب عوام کے حصہ میں آئے تھے، غالباً اردو شاعری میں یہ پہلا موقع ہے کہ جہاں کسی نظام کی آسودہ حالی کا دارومدار ان دستکاروں اور پیشہ وروں پر بتایا گیا ہے جن کی تباھی دراصل پورے نظام معیشت کی تباھی ہے۔ ان میں سے بعض کا حال **نظیر** کی زبانی سنئے:—

زر کے بھی جتنے کام تھے وہ سب دبک گئے
اور ریشمی قوام بھی یکسر چٹک گئے

زر دار اٹھ گئے تو بٹئے سرک گئے
چلنے سے کام تار کشوں کے بھی ٹھک گئے
کیا بال پتلے کھینچے جو ہو جاوے تار بند

بیٹھے بساطی راہ میں تنکے سے چنتے ہیں
جتنے ہیں نانبائی تو بھڑ بھونجے بھنتے ہیں
دھنئے بھی ہاتھ ملتے ہیں اور سر کو دھنتے ہیں
روتے ہیں وہ جو مشروع و درائی بنتے ہیں
اور وہ تو مر گئے جو بنے تھے آزار بند

گر کاغذی کے حال کے کاغذ کو دیکھئے
مطلق اسے خبر نہیں کاغذ کے بھاؤ سے
ردی، قلم دکاں میں نہ ٹکڑے ہیں ٹاٹ کے
یاں تک کہ اپنی چٹھی کے لکھنے کے واسطے
کاغذ کا مانگتا ہے ہر اک سے آدھار بند

آمد نہ خادموں کے تئیں مقبروں کے بیچ
بامھن بھی سر پٹکتے ہیں سب مندروں کے بیچ
عاجز ہیں پڑھنے والے بھی سب مدرسوں کے بیچ
حیراں ہیں پیر زادے بھی اپنے گھروں کے بیچ
نذر و نیاز ہو گئی سب ایک بار بند

مختلف پیشہ وروں کی حالت زار بیان کرنے کے بعد **نظیر** نے سپاہیوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ جن لوگوں نے سودا اور میر کی ہجویات اور شہر آشوب پڑھے ہیں انہیں معلوم ہے کہ واقعی سپاہ کا کیا حال تھا ۔ آئے دن کی یورشوں نے خزانے خالی کر دئے تھے، با قاعدہ فوج اس زمانے میں کم ہوتی تھی سلاطین اپنے رئیسوں کے سواروں اور پیادوں پر بھروسہ کرتے تھے، یہ رئیس تباہ ہوئے تو فوج کا یہ نظام بھی درہم برہم ہو گیا ۔ سپاہیوں کو وقت پر تنخواہ نہیں ملتی تھی ۔ نیا ساز و سامان خریدنا درکنار پرانے سامان کو بیچ بیچ کر گزر اوقات کرتے تھے ۔ مفلسی نے ان کے سب کس بل نکال دئے

تھے ویسے ہر زمانہ میں سپاھیوں کو بڑا عروج حاصل رہا تھا کیونکہ حکومت انھیں کے بل بوتے پر قائم تھی اور تخت کا فیصلہ وراثت یا حق کی بجائے زور شمشیر سے ھی کیا جاتا تھا۔ اب اس طبقہ کا جو حال ھوا وہ **نظیر** سے سنئے :—

کیونکر بھلا نہ مانگئے اس وقت سے پناہ
محتاج ھو جو پھرنے لگے در بدر سپاہ
یاں تک امیر زادے سپاھی ھوئے تباہ
جن کی جلو میں چلتے تھے ھاتھی و گھوڑے آہ
وہ دوڑتے ھیں اور کے پکڑے شکار بند

ھے جن سپاھیوں کنے بندوق اور سناں
گردے کا اس پہ نام نہ چلہ کا ھے نشاں
بندے کے بند تار تر پیتل کے ھیں کماں
ناچار اپنی روزی کا باعث سمجھ کے ھاں
رسی کے اس میں باندھے ھیں پیادے سوار بند

جو گھوڑا اپنا بیچ کے زیں کو گرو رکھیں
یا تیغ اور سپر کو لئے چوک میں پھریں
پٹکا جو بکتا آوے تو کیا خاک دے کے لیں
دو پیش قبض تک کی پڑی روٹی پیٹ میں
پھر اس کا کون مول لے وہ لچھے دار بند

جتنے سپاھی یاں تھے نہ جانے کدھر گئے
دکھن کے تئیں نکل گئے یا پیشتر گئے
ھتھیار بیچ ھو کے گدا در بدر گئے
جب گھوڑے پانے والے بھی یوں در بدر گئے
پھر کون پوچھے ان کو جو اب ھیں کٹار بند

پھرتے ھیں نوکری کو جو بن کر رسالدار
گھوڑوں کی ھے لگام نہ اونٹوں کی ھے مہار

کپڑا نہ لتا مال نہ پرتل نہ بوجھ بھار
یوں ہر مکاں میں آ کے اترتے ہیں سوگوار
جنگل میں جیسے دیتے ہیں لا کر اتار بند

مختلف پیشوں کا ذکر کرنے کے بعد عام شہر کی تباہی اور ویرانی کا حال بیان کیا ہے ۔ یہ بیان حد درجہ المناک ہے :—

ہے کون سا وہ دل جسے فرسودگی نہیں
وہ گھر نہیں کہ روزی کی نابودگی نہیں
ہرگز کسی کے حال میں بہبودگی نہیں
اب آگرے میں نام کو آسودگی نہیں
کوڑی کی آ کے ایسی ہوئی راہ گذار بند

ہیں باغ جتنے یاں کے سو ایسے پڑے ہیں خوار
کانٹے کا نام ان میں نہیں پھول در کنار
سوکھے کھڑے ہوئے ہیں درختان میوہ دار
کیاری میں خاک دھول روش پر اڑے غبار
ایسی خزاں کے ہاتھوں ہوئی ہے بہار بند

اس ابتری کا حال پڑھ کر انسان سوچنے لگتا ہے کہ آخر اس کا سبب کیا ہو سکتا ہے ۔ اس عہد کی شاعری میں یہ دلخراش صدائیں بار بار سنائی دیتی ہیں اور یہ سوال بار بار پیدا ہوتا ہے ۔ اس کا اصلی سبب بقول **نظیر** صرف یہ ہے کہ لوگ ملک کے نظم و نسق کے ذمہ دار تھے وہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لائق نہیں رہے ۔ پرانے لوگ اٹھ گئے اور ان کے جانشین نا اہل ثابت ہوئے ۔

بے وارثی سے آگرہ ایسا ہوا تباہ
ٹوٹی حویلیاں ہیں تو ٹوٹی شہر پناہ
ہوتا ہے باغبان سے ہر اک باغ کا نباہ
وہ باغ کس طرح نہ لٹے اور اجڑے آہ
جس کا نہ باغبان ہو نہ مالک نہ خار بند

ان معاشی حالات میں قدرتی طور پر اخلاق اقدار کا تصور بھی بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا - نظیر پہلے شاعر ہیں جن کے کلام میں یہ واضح تصورات ملتے ہیں - روٹی کا مسئلہ بیسویں صدی میں اس قدر اہم معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ زندگی کے تمام مسائل کو اسی سے وابستہ سمجھتے ہیں - لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نظیر کے زمانے میں بھی یہ مسئلہ بنیادی حیثیت رکھتا ہوگا ، بعض لوگ ہمارے قدیم شعرا پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ اس قدر ذاتی اور داخلی رنگ اختیار کرتے ہیں کہ ان کے کلام سے ان کے ماحول کے حالات اور واقعات کے بارہ میں کچھ پتہ نہیں چل سکتا ، غزل پر خاص طور سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے اور یقیناً غزل میں داخلی کیفیات کی ترجمانی کی جاتی ہے لیکن یہ داخلی جذبات خود ماحول سے پیدا ہوتے ہیں - اور اس طرح بلا واسطہ اپنے ماحول کی ترجمانی کرتے ہیں ، بعض اوقات تو یہ ترجمانی اس درجہ صاف اور واضح ہو جاتی ہے کہ غزلیں خاص ملکی حالات اور واقعات کا چربہ معلوم ہوتی ہیں - مثلاً حاتم کی غزلوں کی تاریخیں معلوم ہیں - ان میں جو غزلیں نادری حملہ کے دوران میں یا فوراً اس کے بعد لکھی گئی ہیں ان میں اس کشت و خون ، غارت گری ، افراتفری اور طوائف الملوکی کے واضح اشارے موجود ہیں جن کی تفصیلات تاریخوں میں موجود ہیں - خواجہ میردرد کا کلام عام طور پر روحانی اور صوفیانہ سمجھا جاتا ہے لیکن اس دور کے سیاسی اور ملکی حالات کو استعاروں اور کنایوں میں انھوں نے ایسی خوبصورتی سے ادا کیا ہے کہ غزل کا داخلی رنگ بھی قائم رہا ہے اور یہ ترجمانی بھی ہو گئی ہے - اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ میر کا کلام ان کی سیرت کی تصویر اور ان کے زمانہ کا آئینہ دار ہے -

نظیر نے ان استعاروں اور کنایوں کو چھوڑ کر جو غزل گو شعرا استعمال کرتے تھے صاف گوئی کا ایک نیا طرز اختیار کیا اور غالباً اسی وجہ سے انھوں نے ان خیالات کے اظہار کے لئے مسدس یا مخمس کو اختیار کیا - مخمس کو خاص طور پر اس وجہ سے کہ اس میں

پانچواں مصرعہ اس خاص جذبہ یا حالت کے شدید تاثر میں تسلسل قائم رکھتا ہے۔ جس طرح سودا پہلے شخص ہیں جنھوں نے مرثیہ کے لئے مسدس کا پیمانہ اختیار کیا جو مسلسل واقعات کے بیان کے لئے سب سے بہتر پیمانہ ہے اور جسے انیس و دبیر سے لے کر حالی اور اقبال تک نے استعمال کیا ہے اسی طرح نظیر پہلے شخص ہیں جنھوں نے مخمس سے یہ کام لیا، اور اپنی بیشتر نظموں میں اسے اختیار کیا۔

نظیر کے کلام کے اس حصہ میں جسے میں معاشیاتی کہتا ہوں سب سے پہلے ہماری نظر ان کے مشہور مخمس آٹے دال پر پڑتی ہے، اردو کا مشہور محاورہ ہے کہ فلاں شخص کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گیا یعنی معاشی تنگ حالی نے اسے پریشان حال بنا ڈالا، آٹے دال اور اس کے بھاؤ کی اہمیت کو نظیر نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے :

کیا کہوں یارو میں نقشہ خلق کے احوال کا
اہل دولت کا چلن یا مفلس و کنگال کا
یہ بیاں تو واقعی ہے ہر کسی کے حال کا
کیا تونگر کیا غنی کیا پیر اور کیا بالکا
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

اس کے بعد عادت کے مطابق نظیر نے سماج کے مختلف طبقوں کی آٹے دال کی فکر کا حال الگ الگ لکھا ہے۔ مثلاً درباریوں کا رنگ دیکھئے :

گر نہ آٹے دال کا ہوتا قدم ہاں درمیان
منشی و میر و وزیر و بخشی و نواب و خان
جا گتے دربار میں کیوں آدھی رات ہاں
کیا عجب نقشہ پڑا ہے آن کیا کہئے میاں
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

اور تو اور عاشقوں اور حسینوں کو بھی جنھیں اس جنجال سے زیادہ سروکار نہیں ہوتا یہ فکر دامنگیر رہتی ہے۔

اپنے عالم میں یہ آٹا دال بھی کیا فرد ھے
حسن کی آن و ادا سب اس کے آگے گرد ھے
عاشقوں کا بھی اسی کے عشق سے منہ زرد ھے
تا کجا کہئے کہ کیا وہ مرد یا نامرد ھے
سب کے دل کو فکر ھے دن رات آٹے دال کا

پیسہ ھی رنگ روپ ھے پیسہ ھی مال ھے
پیسہ نہ ھو تو آدمی چرخے کی مال ھے

نظیر کا یہ شعر ایک ضرب‌المثل بن چکا ھے، پیسے کے بیان میں نظیر نے جو مسدس لکھا ھے اس میں حقیقت نگاری کا ایسا کمال ھے جو ایک کامل فنکار کو ھی حاصل ھو سکتا ھے۔

پیسہ ھی حسن دیتا ھے انسان کی بات کو
پیسہ ھی زیب دیتا ھے بیاہ اور برات کو
بھائی سگا بھی آن کے پوچھے نہ بات کو
بن پیسے یارو دولہا بنے آدھی رات کو
پیسہ ھی رنگ روپ ھے پیسہ ھی مال ھے

....

جن لوگوں نے کسی غریب کی برات دیکھی ھو وہ نظیر کے اس بند سے پوری طرح لطف اندوز ھو سکتے ھیں۔ ظاھر ھے یہ موقع ایسا ھوتا ھے کہ انسان جی کھول کر خرچ کرنا چاھتا ھے۔ نام و نمود کا اظہار کیا جاتا ھے۔ عزیزوں دوستوں کو کھلانا پلانا ھوتا ھے۔ ناچ رنگ کی محفلیں اور طرب کی مجلسیں ھوتی ھیں۔ لیکن سب پیسہ ھے پیسہ نہ ھو تو بیچارہ دولہا پا پیادہ دولہن کے گھر پہنچتا ھے اور یہ تقریب سوگواری کی سی خاموشی سے ادا ھو جاتی ھے۔ نہ جلوس نہ باجا تاشہ، نہ دعوتیں نہ انعام و اکرام۔ آگے سنئے:

پیسے نے جس مکاں میں بچھایا ھے اپنا جال
پھنستے ھیں اس مکاں میں فرشتوں کے پر و بال

پیسے کے آگے کیا ھیں یہ محبوب خوش جمال
پیسہ پری کو لائے پرستان سے نکال
پیسہ ھی رنگ روپ ھے پیسہ ھی مال ھے

....

تیغ و سپر اٹھاتے ھیں پیسے کے واسطے
تیر و سنان لگاتے ھیں پیسے کے واسطے
میداں میں زخم کھاتے ھیں پیسے کے واسطے
یاں تک کہ سر کٹاتے ھیں پیسے کے واسطے
پیسہ ھی رنگ روپ ھے پیسہ ھی مال ھے

....

نظیر کی یہ دونوں نظمیں ایک ایسی سوسائٹی کی ترجمانی کرتی ھیں جہاں لوگ ذھنی اور اخلاقی اعتبار سے دیوالیہ ھو چکے ھیں اور ان کے نزدیک دنیا کی تمام اقدار صرف روپیوں اور پیسوں سے ناپی تولی جا سکتی ھیں ۔ بلا شبہ یہ کوئی صحت مندانہ رجحان نہیں لیکن اس عہد میں ایسا ھو جانا بھی کوئی تعجب کی بات نہیں اور نظیر نے یہاں ایسی حقیقت نگاری سے کام لیا ھے جو ان کے عہد اور تصورات عہد کو ھمارے لئے بے نقاب کر دیتی ھے ۔

اسی سلسلہ کی ایک اور نظم روپے کی تعریف کے عنوان سے ھے' نظیر کے بقول وہ رقص و سرود کی محفلیں جہاں طبلہ، ستار، سارنگی اور مجیروں سے دنیا فردوس گوش معلوم ھوتی ھے ۔ اسی روپے کی کرشمہ سازیاں ھیں ۔ زر و زیور، موتی و جواھر کے تمام ٹھاٹھ باٹھ اسی کی بدولت ھیں ۔ جو لوگ بن ٹھن کر میلوں میں جاتے ھیں ۔ تماشوں میں شرکت کرتے ھیں، شیرینی اور میوے منگاتے ھیں خود کھاتے ھیں اور دوسروں کو کھلاتے ھیں ۔ وہ بھی اسی روپے کی بدولت ھیں ۔ جھمکدار پوشاک، حشمت کے چمنکار، محلات، باغات سب میں اسی روپے کا روپ جھلکتا ھے ۔ اور اسی روپ سے حسن فسونکار مہیا ھوتا ھے ۔ طرہ زر تار اور موتیا اور موتیوں کے ھار بھی اسی کی

جھلک ھیں - گرمی ھو تو اسی سے عیش کے سامان مہیا ھوتے ھیں - خس خانے بنائے جاتے ھیں، عطر چھڑکے جاتے ھیں، دن کو ٹھنڈک کے یہ نشان ھوتے ھیں - رات کو سونے کے لئے ھوادار مکان بنتے ھیں، برسات ھو تو اس کا سامان بھی اسی کی بدولت مہیا ھوتا ھے - رتھ، چھتریاں، بارانیاں' موم کی چادریں سب اسی کے فیض کے نشان ھیں -

نقشہ ھے عیاں سو طرب و رقص کی رے کا
ھے ربط بہم طبلہ و سارنگی و نے کا
جھنکار مجیروں کی ھے اور شور ھے نے کا
مینا کی چھلک جام ادھر چھلکے ھے مے کا
جھمکا نظر آتا ھے ھر ایک عیش کی شے کا
دنیا میں عجب روپ جھلکتا ھے روپے کا

اس روپ سے ھے حسن فسوں کار مہیا
اس روپ سے فرحت کے ھیں آثار مہیا
گجرے سے لگا طرۂ زر تار مہیا
کیا موتیا ھے موتیوں کے ھار مہیا
جھمکا نظر آتا ھے ھر ایک عیش کی شے کا
دنیا میں عجب روپ جھلکتا ھے روپے کا

نظیر کی اس قبیل کی نظموں کے مطالعہ سے ایسا معلوم ھوتا ھے کہ پیسے کی یہ طلب محض جسمانی عیش و آرام بلکہ جنسی لذت کی آسودگی کی خاطر ھے - یہ مسئلہ نہایت اھم ھے کہ نظیر کی ان نظموں میں اور ان کے علاوہ اس عہد کے بیشمار شعرا کی غزلوں، مثنویوں اور ریختی میں یہ جذبہ کیوں اس قدر نمایاں ھوا ھے - بظاھر اس کا ایک ھی سبب معلوم ھوتا ھے - جمالیاتی حسن انسان کی فطرت کا جزو ھے - جو اپنے اظہار اور تسکین کے لئے قدیم سے قدیم سوسائٹی میں بھی کوئی وسیلہ تلاش کر لیتا ھے - رقص، موسیقی، مصوری اور شاعری ان میں سے بعض وسائل ھیں جن میں ذوق جمال کی تسکین ھوتی ھے - ان میں سے کوئی وسیلہ بند ھو تو قدرتی طور پر یہ ذوق دوسری راھیں اختیار

کرتا ہے۔ مثلاً مسلمانوں نے بعض پابندیوں کی بنا پر بت تراشی، مجسمہ سازی اور مصوری کو اختیار نہیں کیا۔ تو اس جذبہ نے خطاطی، نقاشی اور معماری میں ایسے کمالات دکھائے جن سے اس جذبہ کی تسکین بھی ہو گئی اور نئے وسائل بھی سامنے آ گئے، مغلوں کے دور تک یہ وسائل اپنے پورے شباب پر تھے خطاط' نقاش اور ان کے ساتھ مصور بھی شاہانہ سرپرستی میں فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے اور عوام بھی خاص تربیت یافتہ ذوق جمال رکھتے تھے' معاشی انحطاط نے ان راہوں کو بھی مسدود کر دیا تو جذبات نے غیر فطری راہیں اختیار کیں۔ شاعری میں ایہام گوئی سے لے کر لکھنو کی رعایت لفظی اور صنعت کاری تک اسی جذبہ کی ترجمان ہیں یہ زوال یا پستی زندگی کے تمام شعبوں میں نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ صرف دولت کے بھوکے نظر آتے ہیں اور دولت کی طلب بھی زبان کے چٹخارے' عمدہ پوشاک اور حسن فسوں کار کے حاصل کرنے کے لئے محدود ہے۔

ان نظموں کے بعد اب نظیر کی ان نظموں کو دیکھئے جن کا موضوع تو یہی ہے لیکن انداز مختلف ہے۔ نظیر کے کلام میں خوش طبعی اور خوش باشی ایک بنیادی عنصر ہے۔ ایسی معاشی تنگ حالی میں بھی وہ فقرے بازی اور پھبتی سے نہیں چوکتے۔ انداز بیان ایسا مضحک اختیار کرتے ہیں کہ انسان چند لمحوں کے لئے اس موضوع کی تلخی کو بھول کر نظیر کے ساتھ قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک مخمس کا عنوان ہے روٹیوں کی تعریف۔

جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں
پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں
سینے اُپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے جس کا ناک تلک پیٹ ہے بھرا
کرتا پھرے ہے کیا وہ اچھل کود جا بجا
دیوار پھاند کر کوئی کوٹھا اچھل گیا
ٹھٹھا ہنسی، شراب، صنم، ساقی، اس سوا
سو سو طرح کی دھوم مچاتی ہیں روٹیاں
جس جا پہ ہانڈی چولھا توا اور تنور ہے
خالق کی قدرتوں کا اسی جا ظہور ہے
چولھے کے آگے آنچ جو جلتی حضور ہے
جتنے ہیں نور سب میں یہی خاص نور ہے
اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں

روٹیاں صرف پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے ہی ضروری نہیں، معرفت نفس اور معرفت حق بھی اسی وقت حاصل کرنے کا ولولہ ہوتا ہے جب پیٹ بھرا ہو۔

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے
یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے سے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھکو خیر دے
ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

اسی روٹی کے کمانے کی خاطر لوگ سو سو طرح کے جتن کرتے ہیں۔ مکر و فریب دغل، جعلسازی سب اسی کی خاطر ہے۔

کپڑے کسی کے لال ہیں روٹی کے واسطے
لنبے کسی کے بال ہیں روٹی کے واسطے
باندھے کوئی رومال ہیں روٹی کے واسطے
سب کشف اور کمال ہیں روٹی کے واسطے
جتنے ہیں روپ سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

یہی طلب معاش انسان کو نفس فروشی، بے غیرتی اور بے شرمی پر مجبور کر دیتی ہے نظیر کے بقول جن طوائفوں کو ہم ذلیل و خوار

اور آلۂ تفریح سمجھتے ہیں وہ اسی معاشی نظام کی شکار ہیں جس میں انسان کو پیٹ بھرنے کے لئے روٹی تلاش کرنا ہو تو ایسی ذلت پر آترنا پڑتا ہے۔

روٹی سے ناچے پیادہ قواعد دکھا دکھا
اسوار ناچے گھوڑے کو کاوہ لگا لگا
گھنگھرو کو باندھے پیک بھی پھرتا ہے ناچتا
اور اس سوا جو غور سے دیکھا تو جا بجا
سو سو طرح کے ناچ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی کے ناچ تو ہیں سبھی خلق میں پڑے
کچھ بھانڈ بھگتیئے یہ نہیں پھرتے ناچتے
یہ رنڈیاں جو ناچے ہیں گھونگھٹ کو منہ پہ لے
گھونگھٹ نہ جانو دوستو تم زینہار اسے
اس پردے میں وہ اپنی کماتی ہیں روٹیاں

آخری بند میں نظیر اس معاشی تنگ حالی کا ذکر کرتے ہیں جس میں غالباً وہ خود مبتلا تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارغ البالی تو ایک خواب تھی انہیں روکھی سوکھی روٹی کی تلاش کے لئے بھی غیر معمولی جد و جہد کرنا پڑتی تھی۔

روٹی کا اب ازل سے ہمارا تو ہے خمیر
روکھی ہی روٹی حق میں ہمارے ہے شہد و شیر
یا پتلی ہووے موٹی خمیری ہو یا فطیر
گیہوں، جوار، باجرے کی جیسی بھی ہو نظیر
ہم کو تو سب طرح کی خوش آتی ہیں روٹیاں

اسی مضمون کی ایک اور نظم ''در صفت چپاتی'' ہے۔

جب ملی روٹی ہمیں سب نور حق روشن ہوئے
رات دن شمس و قمر شام و شفق روشن ہوئے

زندگی کے تھے جو کچھ نظم و نسق روشن ہوئے
اپنے بیگانوں کے لازم تھے جو حق روشن ہوئے
دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے
اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

پوری نظم میں اسی قسم کے خیالات ہیں جو پہلے مخمس میں ہیں۔ ''درمیان تلاش زر'' بھی اسی قبیل کی نظموں میں ہے۔ جس کا ایک شعر یہ ہے۔

جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہر اک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر

اس میں 'زر' کی بہت سی کرامتیں بیان کی ہیں مثلاً:

زر کے دئے سے پیر اور استاد نرم ہو
زر کے سبب سے دشمن ناشاد نرم ہو
جو شوخ سنگدل ہے پریزاد نرم ہو
زر وہ ہے جس کو دیکھ کے فولاد نرم ہو
جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر

جا لوگ روم و شام میں زر کو کماتے ہیں
ماچین چین زر کے جہاز آتے جاتے ہیں
دکھن سے زر کے واسطے سب یاں کو آتے ہیں
اور یاں سے زر کے واسطے دکھن کو جاتے ہیں
جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر

دکن سے شمالی ہندوستان میں آنے والوں کا اشارہ مرہٹوں کی طرف ہے جو ہر حملہ میں بیشمار زر و جواہر لوٹ کر لے جاتے تھے، خود غرض رئیس متحد ہو، ان کا استیصال کرنے کی جگہ ان سے فرداً فرداً صلح نامہ کر لیتے تھے اور تاوان جنگ کے علاوہ چوتھ بھی ادا کرتے تھے، شمالی ہند سے دکن جانے والوں سے مراد وہ بیشمار سپاہی ہیں جو دکھن کے معرکوں میں کام آئے یا پھر وہ جو دلی کی تباہی اور

شمالی ہند کی افراتفری سے گھبرا کر ڈھاکہ، مرشدآباد لکھنو یا حیدرآباد ھجرت کر رہے تھے،

اس عنوان کو ختم کرنے سے پہلے میں **نظیر** کی ایک اور نظم در بیان مفلسی کا ذکر اور کرنا چاھتا ھوں، زر کی کرامات اور روٹی کی بہاریں تو آپ دیکھ چکے اب یہ دیکھئے کہ مفلسی کیا کیا تماشے دکھاتی ھے۔ **نظیر** کی یہ نظم نسبتاً طویل ھے اور انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں مفلسی کی مختلف حالتوں کا نقشہ بڑے ظریفانہ انداز میں کھینچا ھے۔ مختلف پیشہ وروں اور صنعت کاروں کا الگ الگ حال بیان کیا ھے کہ مفلسی کی بدولت وہ اپنے پیشے اور فن سب کو بھول جاتے ھیں علم اور کمال دونوں مفلسی کی بدولت پامال ھو جاتے ھیں۔ انسان حلال اور حرام کی تمیز بھول جاتا ھے۔ شرم و حیا سب اس کی آندھی میں اڑ جاتے ھیں مفلس کو نہ گھر میں چین ملتا ھے نہ باھر آرام، محفلوں اور مجلسوں میں لوگ اس کا مذاق آڑاتے ھیں، اس پر فقرے کسے جاتے ھیں، گھر کا نقشہ یہ ھوتا ھے کہ نہ بی بی کی ناک میں نتھ رھتی ھے جو سہاگ کی نشانی ھوتی ھے اور عورت مرتے دم تک اسے آتارنا پسند نہیں کرتی اور نہ لڑکیوں لڑکوں کے ھاتھوں میں کڑے رھتے ھیں، بیوی نکھٹو کہتی ھے۔ بھائی اور بیٹا بھی بات نہیں پوچھتا غرض زندگی ایسی تلخ ھوتی ھے کہ موت کی تلخی اس کے مقابلہ میں بخوشی گوارا ھوتی ھے، **نظیر** کی زبانی ان میں سے بعض کیفیات سنئے:—

کہئے تو اب حکیم کی سب سے بڑی ھے شان
تعظیم جس کی کرتے ھیں نواب اور خان
مفلس ھوئے تو حضرت لقمان کیا ھیں یاں
عیسیٰ بھی ھو تو کوئی نہیں پوچھتا میاں
حکمت حکیم کی بھی ڈباتی ھے مفلسی
جو اھل فضل عالم و فاضل کہاتے ھیں
مفلس ھوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ھیں

پوچھے کوئی الف تو اسے بے بتاتے ہیں
وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
آن کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

اس بند میں **نظیر** نے یقیناً اپنے ذاتی حالات اور واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بیچارے کی تمام عمر اکبرآباد میں معلمی کرتے گذری اگر روایت صحیح ہے تو وہ روزانہ صبح بستی تاج محل سے اپنے مریل ٹٹو پر بیٹھ کر آگرہ چلے جاتے تھے، دن بھر لڑکے پڑھاتے تھے، غالباً کھانا مل جاتا ہوگا، شام کو اسی ٹٹو پر گھر لوٹ آتے تھے، مفلسی کا یہ چکر ایسا تھا جس سے غالباً **نظیر** کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوا، سستی قسم کی تفریحات میں جہاں بیشتر اوباش جمع ہوتے تھے ان کا شریک ہونا بھی غالباً مفلسی کے اس غم کو غلط کرنے کے لئے تھا جس کے لئے امراء کو مے و منیا اور حسن فسوں کار کی آغوش بھی میسر ہوتی ہے لیکن ان کے لئے میلوں ٹھیلوں، یا زیادہ سے زیادہ ادنیٰ درجہ کی طوائفوں کے کوٹھے سے آگے ذہنی سکون یا غم غلط کرنے کا کوئی اور موقع حاصل نہ تھا، نظیر کی ان تمام نظموں کے مطالعے میں جن میں اس قسم کا عامیانہ رنگ پایا جاتا ہے اس پس منظر کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ نظم کے کچھ اور بند یہ ہیں۔

جب خوبرو پہ آن کے پڑتا ہے دن سیاہ
پھرتا ہے بوسے دیتا ہر اک کو خوامخواہ
ہرگز کسی کے دل کو نہیں ہوتی اس کی چاہ
گر حسن ہو ہزار روپئے کا تو اس کو آہ
کیا کوڑیوں کے مول بکاتی ہے مفلسی

اسی کے بعد نظیر نے کئی بند ایک مفلس رنڈی کی حالت زار بیان کرنے پر صرف کئے ہیں مضمون عامیانہ ہے لیکن اسے بھی نظیر کے ذاتی تجربات کی ترجمانی سمجھنا چاہئے۔

کیسی ہی دھوم دھام کی رنڈی ہو خوش جمال
جب مفلسی کا آن پڑے سر پہ اس کے جال

دیتے ہیں اس کے ناچ کو ٹھٹھے کے بیچ ڈال
ناچے ہے وہ تو فرش کے اوپر قدم سنبھال
اور اس کو انگلیوں پہ نچاتی ہے مفلسی

اس کا تو دل ٹھکانے نہیں بھاؤ کیا بتائے
جب ہو پھٹا دوپٹہ تو کاہے کو منہ چھپائے
لے شام سے وہ صبح تلک گو کہ ناچے گائے
اوروں کو آٹھ سات تو وہ دو ٹکے ہی پائے
اس لاج سے اسے بھی لجاتی ہے مفلسی

جس کسبی رنڈی کا ہو فلاکت سے دل حزیں
رکھتا ہے اس کو جب کوئی آ کر تماش بیں
اک پون پیسے تک بھی وہ کرتی نہیں نہیں
یہ دکھ اسی سے پوچھئے اب آہ جس کے تئیں
صحبت میں ساری رات جگاتی ہے مفلسی

وہ تو یہ سمجھے دل میں کہ دھیلا جو پاؤنگی
دمڑی کے پان، دمڑی کی مسی منگاؤنگی
باقی رہا چھدام، تو پانی بھراؤنگی
پھر دل میں سوچتی ہے کہ کیا خاک کھاؤنگی
آخر چبینا اس کا بھناتی ہے مفلسی

یہ اشعار ممکن ہیں بعض حضرات کی طبع نازک پر گراں گزریں لیکن اس کے لئے میں **نظیر** کو ذمہ دار نہیں ٹھیراؤنگا، نظیر نے معاشی تباہ حالی کے ساتھ فروغ پانے والی ادنیٰ درجے کی عیاشی کا حال بیان کیا ہے لیکن اس سے ان کا مقصود لذت حاصل کرنا نہیں ہے، اور غالباً بعض موجودہ دور کے فحاشی نگاروں اور **نظیر** میں یہی چیز مابہ الامتیاز ہے - حقیقت نگاری اور صاف گوئی دونوں جگہ موجود ہے۔ لیکن ایک اس سے جنسی لذت حاصل کرتا ہے اور دوسرا محض تلخی کا اظہار کرتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس مفلسی نے **نظیر** کی خانگی زندگی کو بھی نہایت تلخ بنا دیا تھا، ایک خمسہ کے بعض بند کچھ اس قسم کی کیفیت پیش کرتے ہیں جو **میر** اور **مصحفی** کے اشعار میں ملتی ہے جو انہوں نے اپنے مکان کے حال میں لکھے ہیں۔ **نظیر** نے خانہ ویرانی کے علاوہ بیوی بچوں اور عزیز رشتہ داروں کے حال پر بھی اظہار خیال کیا ہے:—

کمخواب، تاش، مشروع، تن زیب، خاصا، ململ
سب مفلسی کے ہاتھوں گئے اپنے ہاتھ سلمل
پگڑی رہی نہ جامہ، پٹکا رہا نہ آنچل
نے ٹاٹ کی قبا پر جوڑا پرانا کمبل
ابرا ملا تو ایسا استر ملا تو ایسا

چرپائی بیچ کھائی اور بان کو جلا کر
روٹی پکائی رو رو اور کھائی آہ بھر بھر
سونے کے وقت جھنگا گدڑا رہا نہ چادر
کہنی پہ سر کو رکھ کر سوئے فقط زمیں پر
تکیہ ملا تو ایسا بستر ملا تو ایسا

ہو صبح اور سورج جب آ کے منہ دکھائے
نے شام تک اسی کے گھر بیچ دھوپ جائے
آندھی چلے تو گھر میں سب خاک دھول آئے
برسے جو مینہ تو باہر ایک بوند بھر نہ جائے
پھوٹے نصیب ایسے چھپر ملا تو ایسا

در مفلسی میں اس نے دو تین لڑکے پائے
اور کنبے والے لڑکے واں کھیلنے کو آئے
دیکھ ان کے گہنے پاتے آنکھوں میں آنسو لائے
سرکی کو چھیل بچے نتھ اور کڑے بنائے
بد بخت کے بچوں کو زیور ملا تو ایسا

اسباب تھا تو کیا کیا رکھتے تھے لوگ رشتا
مفلس ہوا تو ہرگز رشتا رہا نہ ناتا
نے بھائی، بھائی کہتا، نے بیٹا کہتا بابا
اس پر **نظیر** مجھ کو رونا بہت ہے آتا
اس مفلسی زدہ کو ٹبر ملا تو ایسا

نظیر کے کلام کا یہ حصہ اس کی شاعری میں خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ اس زمانہ میں جب شعرا غزل سرائی میں مصروف تھے ان باتوں کو خال خال ہی بیان کرتے تھے کیونکہ یہ مضامین غزل کے خاص موضوع عشق و عاشقی سے خارج ہیں اور جب بیان کرتے تھے تو انہی استعاروں اور کنایوں کی آڑ لیتے تھے جو غزل نے عام کر دئے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ آج اس عہد کی شاعری کے بڑے حصہ کے مطالعہ سے عام زندگی اور اس کے مسائل کا بہت کم اندازہ ہوتا ہے **نظیر** نے بھی غزلیں لکھی ہیں اور ان میں بھی ان کا خاص انداز ہے لیکن ان کا اصلی کمال ایسی نظموں میں ہی کھلتا ہے جہاں انہوں نے زندگی کے ان عام مسائل کا جائزہ لیا ہے، نظیر خود زندگی کی اس جدو جہد میں ایک عام انسان کی طرح شریک ہوئے اس لئے یہ مضامین محض تخیل کی پیداوار یا ساحل سے تماشہ دیکھنے والے کے جذبات نہیں ہیں، پھر ان میں استعارے یا کنایے کے پیچ نہیں ہیں ہر بات صاف صاف بیان کی ہے۔

اخلاق پستی کے سلسہ میں **نظیر** کی بعض اور نظمیں بھی قابل غور ہیں ۔ ان میں سے ایک کا عنوان 'گلہری کا بچہ' ہے، موضوع کا تقاضہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ نظیر گلہری کے بچے کی خوبصورتی، اس کی نرمی و نازکی، شوخی واچپلاھٹ کا ذکر کرتے اور ایک آدھ مصرعے میں واقعی نظیر نے یہ انداز اختیار کیا بھی ہے لیکن باقی نظم امرد پرستی کے رحجان کو بڑے عامیانہ انداز میں پیش کرتی ہے ۔ یہ مسئلہ بجائے خود نہایت تفصیل طلب ہے کہ اردو شاعری بالخصوص غزل میں یہ مضمون کب اور کس طرح داخل ہوا ۔ بعض لوگوں کی

رائے ہے کہ یہ موضوع اردو شعرا کو فارسی سے ورثہ میں ملا، یہ صحیح ہے کہ اردو کے ابتدائی دکھنی دور میں بھی خط رخسار کے طلبگار ملتے ہیں لیکن اسے اس وقت تک اردو شاعری میں روایت کا مرتبہ حاصل نہیں ہوا تھا، سلطان قلی قطب شاہ کی عشقیہ شاعری حقیقت نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے کیونکہ اس میں اس نے مختلف عورتوں سے اپنے عشق کی داستانیں نظم کی ہیں، محبوبوں کے نام بتاتے ہیں اور الگ الگ ان کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ ان تمام نظموں اور غزلوں میں ایک مرد عورت سے اظہار عشق کر رہا ہے اور یہ ایسی روایت ہے جو دکھنی شاعری میں بہت نمایاں ہے۔ عورت کا مرد سے اظہار عشق جو ہندی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیات بتائی جاتی ہے اس دور میں دکھنی میں بھی موجود ہے، جہاں کہیں ان دونوں روایتوں سے انحراف کیا ہے وہاں صرف لڑکوں کے بعض خارجی اوصاف مثلاً خط وغیرہ کی تعریف کی ہے ایسے اشعار مشکل سے ملیں گے جن میں لڑکوں سے عشق بازی امر واقعہ کے طور پر ثابت ہوتی ہو، اس کے بعد دوسرا دور آتا ہے اور سراج اور ولی کے یہاں ان کے محبوب لڑکوں کے واضح نشانات ملتے ہیں، دلی پہنچ کر کج کلاہ لڑکوں کے قتل عام کرنے کا مضمون آبرو، مضمون، شاکر ناجی اور حاتم کے دور سے شروع ہو کر میر کے عطار کے لونڈے تک پہنچتا ہے؟ اس سب کو محض فارسی شاعری کا اثر سمجھنا غلط ہے اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ صوفیوں کی بدولت یہ قباحت عام ہوئی بلکہ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ اس عہد کے مردوں کو عورتوں سے ملنے کے جو کم مواقع ملتے تھے اور اعلیٰ درجہ کی ذھنی تفریحات جو فنون لطیفہ سے حاصل ہوتی ہیں اس کی راہیں آہستہ آھستہ مسدود ہو رہی تھیں اس لئے جنسی بھوک نے آسودگی کا یہ غیر فطری راستہ ڈھونڈ نکالا، اس کا اندازہ منجملہ اور تحریروں کے نواب درگاہ قلی خان کے سفرنامہ سے ہوتا ہے جنہوں نے ۱۱۵۱ھ میں دھلی کا سفر کیا تھا اور وہاں کے نامور حسن پرستوں اور سادہ رووٗں کا حال لکھا ہے

بہر حال **نظیر** کے دور میں اس بیماری کا جو حال ہو گیا تھا وہ اس نظم سے ظاہر ہے جس کا پہلا بند ہے۔

لئے پھرتا ہے یوں تو ہر بشر بچا گلہری کا
ہر اک استاد کے رہتا ہے گھر بچا گلہری کا
و لیکن ہے ہمارا اس قدر بچا گلہری کا
دکھاویں ہم کسی لڑکے کو گر بچا گلہری کا
تو دم میں لوٹ جاوے دیکھ کر بچا گلہری کا

ایک اور خمسہ بھی اسی انداز میں ہے۔ صرف تین بند دیکھئے۔

تھا وصل کا جس طور نشا دل میں دوبالا
ویسا ہی فلک نے یہ خلل ہجر کا ڈالا
کیونکر نہ بہے آنکھ سے اب اشک کا نالہ
پھر ہو کے خفا روٹھ گیا ہم سے وہ لالا
اے داغ مبارک ہو تجھے منصب والا

کئی بند اپنی حالت کے بیان پر صرف کر کے لکھتے ہیں۔

نے زر ہے مرے پاس جو اس شوخ کو دیکھوں
نے زور کہ دھمکا کے اسے پاس بلاؤں
کچھ بن نہیں آتا ہے کسے جا کے سناؤں
گر بس ہو مرا تو میں کسی چور سے کہلاؤں
جا آج پلنگ سونے کا تو اس کے اٹھالا

یہ بات بڑے تعجب کی ہے کہ نظیر جیسا شاعر جو اپنے عام انداز میں روایت شکن ہے، غزل کے بجائے نظم اختیار کرتا ہے اور جس کا ذہن سمرقند و بخارا کی جگہ متھرا، برج اور بنارس کی سیر کرتا ہے اس معاملہ میں روایت پرست ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً صرف یہ ہے کہ شدید معاشی تنگ حالی نے جس میں وہ ہمیشہ مبتلا رہے نظیر کو اپنی جنسی خواہشات کی جائز تسکین سے محروم رکھا اور اس نفسیاتی دباؤ نے جس میں وہ مبتلا ہوئے اظہار کی یہ شکل اختیار

کر لی ۔ ان دو نظموں کے علاوہ بھی جستہ جستہ اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں امرد پرستی کا اشارہ موجود ہے لیکن ان میں بیشتر رسمی مضامین ہیں اور ان کی مجموعی تعداد بھی بہت کم ہے ۔

اس معاشی، ذہنی اور اخلاقی پستی کی تصویر کو مکمل کرنے کے لئے جو نظیر نے آپ کے سامنے پیش کی ہے ۔ ان چند نظموں کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے بھنگ کی تعریف میں لکھی ہیں ۔ مے و مینا کے مضامین ہمیشہ سے شاعری بالخوص غزل میں آب و رنگ پیدا کرنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں، کہیں تو یہ وہی مے آتشیں ہے کہ جس کے دو گھونٹ حلق سے اترتے ہی شاعر کے جذبات میں ہیجان و طوفان برپا کر دیتے ہیں اور کہیں یہ شراب معرفت ہے جس کے جرعہ کش تعینات کی پستی سے بلند ہو کر ستاروں سے آگے کسی اور جہاں میں جا پہنچتے ہیں ۔ ایک عرصہ کے بعد شاعری کے اور مضامین کی طرح مے و مینا بھی صرف بطور استعارہ باقی رہ گئے اور یہ روایت دہلی اور لکھنو کے تمام دور میں قائم و برقرار رہی ۔ لکھنو میں افیون نوشی کا زور زیادہ ہوا تو قدرتی طور پر اس کی تعریف اور اس کے مضامین بھی لکھنوی شاعروں کے یہاں راہ پا گئے، ناسخ اور آتش سے لے کر امانت تک سب کے کلام میں آپ کو اس قبیل کے اشعار مل جاتے ہیں ۔

فرقت خال سیاہ میں مردہ میں محزوں ہوا
موت افیونی کی آئی جب کہ نے افیون ہوا (ناسخ)

بوسہ خال سیاہ دیتے نہیں صاحب اگر
ایک دن سننا کہ بندہ کشتۂ افیون ہوا (ناسخ)

نظیر نے شراب اور افیون دونوں کو چھوڑ کر بھنگ کا نشہ اختیار کیا ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جوگیوں، بیراگیوں، اور فقیروں میں بھنگ کے گھوٹے کا رواج عام تھا اور نظیر نے اپنی آزاد منشی سے اکثر اپنا شمار بھی انہیں کے ساتھ کیا ہے، دوسرے بھنگ کا نشہ شراب اور افیون کے مقابلہ میں سستا اور کم خرچ بھی

ہے۔ اگر **نظیر** نے کبھی نشہ بھی کیا ہوگا تو اپنی معاشی تنگ حالی کی وجہ سے مجبور ہو کر بھنگ پر اکتفا کی ہوگی، ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ **نظیر** عوامی شاعر تھا اور ادنیٰ طبقوں میں اس وقت بھی بھنگ، تاڑی اور چرس کے نشوں کا رواج زیادہ تھا،—لیکن ان سب باتوں کو ایک طرف رکھئے۔ **نظیر** کی یہ نظمیں ایک خاص طنزیہ پہلو بھی رکھتی ہیں اور غالباً **نظیر** کی بجائے ان لوگوں کے حسب حال ہیں جو اس نازک اور پرآشوب دور میں بھی ' بھنگ پی اور ڈنڈ پیل '، کا ورد کرتے رہتے تھے، مثلاً:

کیوں عبث بیٹھا ہے ڈالے کان میں غفلت کا تیل
خلق میں کیا کیا مچی ہے سبزیوں کی ریل پیل
کھول زلف عیش کو اور ڈال بیلے کا پھلیل
پھر چڑھا دے آسمان عیش پر عشرت کی بیل
کونڈی سونٹے کو بجا اور دیکھ ٹک قدرت کے کھیل
چھوڑ سب کاموں کو غافل بھنگ پی اور ڈنڈ پیل

فنا فی المرشد کی طرح فنا فی البھنگ ہونے کی دعوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

اور تجھے کھیتی کی قدرت ہے تو سبزی کو بوا
باغ میں گھر میں صحن میں پیڑ سبزی کے لگا
گھونٹ سبزی، چھان سبزی اور سبزی میں نہا
دیکھ بھی سبزی کو اور سبزی ھی پی سبزی ھی کھا
کونڈی سونٹے کو بجا اور دیکھ ٹک قدرت کے کھیل

ایک اور نظم میں ' بھنگ ' کا مقابلہ اور نشوں سے کیا ہے:

کھا کر افیم ظالم مت ہو جیو افیمی
تن سوکھ کر کھجاوے آواز ہوگی دھیمی
کیوں بھنبھنا بنا ہے اے گلعذار سیمی
عاشق تو اب اسی کے سن مست ہیں قدیمی

پی عاشقوں میں لا کر دو بھنگ کے پیالے
جو ایک دم میں تیرا گھر گھومے چھپر ھالے
تاڑی و سیندھی بوڑا، ظالم اگر پئے گا
پھوے گا پیٹ تیرا یا بیٹھ قے کرے گا
پی کر شراب ناحق کیچڑ میں گر پڑے گا
اور یہ نشہ تو کوٹھے چھجے پہ سے اوڑے گا
پی عاشقوں میں آ کر دو بھنگ کے پیالے

....

اسی طرح اس کا مقابلہ گانجے اور چرس سے کیا ھے:

نظیر کے ماحول کے مطالعے کے بعد اب ان کی شاعری کے بعض دیگر عناصر کا جائزہ لینا ضروری ھے۔ ان میں سب سے اھم مقامی رنگ ھے۔ آردو شاعری پر ایک عام اعتراض یہ ھے۔ کہ اس میں ابتدا سے فارسی کی تقلید پر اس قدر زور دیا گیا ھے کہ اگر آردو شعرا کی طبیعت میں اپچ اور ایجاد کا کچھ مادہ تھا بھی وہ اس روایت کی بدولت بالکل دب کر رہ گیا۔ دکھنی ادب کے مطالعے نے اب عام طور پر اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا ھے لیکن دکھنی زبان کی قدامت اور اس کے باعث کسی قدر اجنبیت کی وجہ سے اب بھی دکھنی شاعری کے بہترین نمونے عام طور پر متعارف نہیں ھیں۔ لیکن دکھنی ادب کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ھے کہ دکھنی دور میں شاعری اور ادبی زبان بیان اور موضوعات دونوں کے اعتبار سے گہرے مقامی اثرات کے حامل ھیں۔ عورت کا مرد سے اظہار عشق خالص ھندوستانی تصور ھے جس میں بڑا دخل کنہیا اور رادھا کے رومان کو ھے۔ یہ روایت عربی یا ایرانی شاعری سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی اور ھمارا دکھنی شاعر یہی انداز اختیار کرتا ھے۔ تشبیہات و استعارات میں مقامی اثرات دیکھتا ھوں تو قلی قطب شاہ کی کلیات کا مطالعہ کافی ھے جہاں کبوتر کی جگہ بادل، کوے اور کوئل کو پیغامبر بنایا گیا ھے۔ بلبل کے عشق کی جگہ عام طور پر پپیہے کے عشق کو مثالیہ

انداز مں پیش کیا گیا هے یا پهر بهونرے اور کنول کا
عشق هے اور اس سلسله مں جو نازک مضامین دکهنی شعرا
نے نظم کئے هں ان کی مثالیں صرف برج بهاسا مں هی مل سکتی
هں، محبوب کے رنگ کے سلسله مں دکهنی شاعر همیشه سام برن
کا ذکر کرتا هے۔ غرض کسی پہلو سے دیکهیں دکهنی مں یه مقامی
اثرات نہایت واضح اور نمایاں هں۔ ولی پہلے شخص هں جو شاه
سعد الله گلشن کے مشورے سے فارسی کے مضامین اور آردوئے معلی کے
محاوره کو آردو مں اهمیت دیتے هں اور یہاں سے بیشک آردو کے
مقامی اثرات کی قدیم روایت کی جگه وه عجمی روایات لے لیتی هں جو
درباری اثر سے دهلی اور بعد مں لکهنوی شاعری مں نمایاں هں اور
یه سلسله حالی تک چلتا هے اس کے بعد آهسته آهسته مقامی روایات پهر
آبهرنے لگی هں لیکن اب تک شاعری مں عجمی روایت کے اثرات
باقی هں۔ ناولوں اور افسانوں نے بیشک آردو ادب مں مقامی اثرات
کی نمائندگی کرکے ایک نئے دور کا آغاز کیا هے۔ ولی سے لے کر آج
تک شاید هی کوئی دوسرا شاعر ایسا نکلے جو اس بات خاص مں نظیر
سے بازی لے جا سکے۔

مقامی رنگ کے سلسلے مں سب سے پہلے نظیر کی وه نظمیں آتی
هں جن مں مختلف تہواروں اور تقریبوں کا ذکر کیا گیا هے، ان مں
هولی، دوالی، راکهی، جنم کنهیا جی، بلدیو جی کا میله، درگاجی کے
درشن 'بهیروں' مہادیو جی کا بیاه اور کنهیا راس کے ساته ساته عید اور
شب برات بهی شامل هں۔ هولی کا رنگین تہوار ان مں نظیر کو
سب سے زیاده متاثر کرتا هے چنانچه کئی نظمیں ایسی هں جن مں اس
موقع کی رنگ افشانی، رقص و سرور اور عیش و طرب کا نقشه کهینچا
هے۔ یه تہوار بهی ایسا هے که اس مں عام اور خاص کا کوئی امتیاز
نہیں، اس کا هنگامه اور رونق بعض بعض لوگوں کو شاید عامیانه معلوم
هو لیکن آزاد منش اور قلندر وضع لوگوں کے لئے شاید اس سے زیاده کسی
رنگین تہوار کا تصور ممکن نہیں هے۔

کچھ طبلے کھٹکے تال بجے کچھ ڈھولک اور مردنگ بجے
کچھ جھریں ربابوں کی کچھ سارنگی اور کچھ چنگ بجے
کچھ تار طنبوروں کے جھنکے کچھ دھمدی اور مرچنگ بجے
کچھ گھنگرو جھم جھم جھم جھم کچھ گت گت پر آھنگ بجے
ھے ھر دم ناچنے گانے کا یہ تار بندھایا ھولی نے
ھر جا گہ تھال گلالوں سے خوش رنگت کی گلکاری ھے
اور ڈھیر عبیروں کے لاگے عشرت کی تیاری ھے
ھیں راگ بہاریں دکھلاتے اور رنگ بھری پچکاری ھے
منہ سرخی سے گلنار ھوئے تن کیسر کی سی کیاری ھے
یہ روپ چھمکتا دکھلایا یہ رنگ دکھایا ھولی نے

محض صوتی آھنگ سے یہاں نظیر نے جو کیفیت پیدا کی ھے اس کی مثال اردو شاعری میں کم ملے گی -

ھولی پر کئی نظمیں اور ھیں مثلاً !

ھوا جو آکے نشان آشکار ھولی کا
بجا رباب سے مل کر ستار ھولی کا
سرود و رقص ھوا بے شمار ھولی کا
ھنسی خوشی میں بڑھا کار و بار ھولی کا
زبان پہ نام ھوا بار بار ھولی کا

ایک اور مخمس ھے -

قاتل جو میرا اوڑھے اک سرخ شال آیا
کھا کھا کے پان ظالم کر ھونٹ لال آیا
گویا نکل شفق سے بدر کمال آیا
حب منہ سے وہ پریرو مل کر گلال آیا
اک دم تو دیکھ اس کو ھولی کو حال آیا

ایک اور مخمس میں ھولی کا بیان سفید اور زرد رنگ کے معرکہ کی صورت میں نظم کیا ھے ان تمام نظموں کے پڑھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ نظیر کو ھولی کی رنگ افشانی کے ساتھ ساتھ لوگوں کی آپس

میں چہلین ، گانا بجانا ، پھبتی اور گالی ، غرض ہنگامہ آرائی پسند تھی جس میں ظاہر برستی اور رکھ رکھاؤ کو کسی طرح دخل نہیں ہو سکتا تھا ، یہی حال دیوالی والی نظم کا ہے ، اس میں ہولی کا ہنگامہ اور رنگ افشانی نہیں اس کی جگہ نور افشانی لے لیتی ہے۔ اس موقع پر نظیر نے بڑی خوبی سے دوالی کے میلے کا نقشہ کھینچا ہے :

جہاں میں یارو عجب طرح کا ہے یہ تیوہار
کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے آدھار
کھلونے کھیلوں تماشوں کا گرم ہے بازار
ہر اک دوکان میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار
سبھوں کو صرف ہے اب جا بجا دوالی کا

دوالی میں ہولی کی دھینگا مشتی کی جگہ جوا لے لیتا ہے۔ میاں نظیر نے اسے بھی بڑی تفصیل سے لکھا ۔

کسی نے گھر کی حویلی گرو رکھا ہاری
جو کچھ تھی جنس میسر بنا بنا ہاری
کسی نے چیز کسی کی چرا ہاری
کسی نے گٹھری پڑوسن کی اپنی لا ہاری
یہ ہار جیت کا چرچا پڑا دوالی میں

اس سلسلہ میں میاں نظیر نے جواری میاں اور اس کی بیوی کی نوک جھونک بھی نظم کی ہے۔ عورت گھبرا کر کہتی ہے۔

نکل تو یاں سے ترا کام یاں نہیں بھڑوے
خدا نے تجھ کو تو شہدا کیا دوالی کا

میاں کا جواب بھی سنئے ۔

وہ اس کے جھونٹے پکڑ کر کہے ہے ماروں گا
ترا جو گہنا ہے سب تار تار آتاروں گا
حویلی اپنی تو ایک داؤ پر میں ہاروں گا
یہ سب تو ہارا ہوں خندی تجھے بھی ہاروں گا
ہڑچا ہے مجھ کو تو اب نشا دوالی کا

نظیر کا مقامی رنگ دیکھنا تو خاص طور پر ان نظموں میں دیکھنا چاہئے جو جنم کنھیا جی سے شروع ہوتی ہیں، یہ نظمیں موضوع اور زبان دونوں کے اعتبار سے ایسی ہیں کہ ان پر ہندی اور اردو دونوں کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ ہندی اس اعتبار سے کہ اس میں پرا کرتی عناصر بالخصوص برج بھاشا کے الفاظ اور صرفی اصول موجود ہیں اور اردو اس اعتبار سے کہ اس میں اردو صرف و نحو کی پابندی کے ساتھ زبان ایسی استعمال کی ہے جس کا بڑا حصہ اب تک اردو دان آسانی سے سمجھ سکتے ہیں ایسے زمانہ میں جب ولی کے بعد دکھنی اور پرا کرتی الفاظ آہستہ آہستہ اردو سے خارج ہو رہے تھے، اور دہلوی شعرا فارسی الفاظ کے کثیر استعمال کے ساتھ ساتھ فارسی کے محاوروں تک کا اردو میں ترجمہ کر رہے تھے اور **نظیر** کے آخر زمانہ میں ناسخ کی اصلاح زبان کی بدولت قدیم ہندی الفاظ اور بھی چن چن کر نکالے جا رہے تھے **نظیر** کا اس زبان کو اختیار کرنا اردو زبان کی تاریخ میں ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ دیسی زبانوں کے الفاظ ہمارے دوسرے شعرا نے بھی استعمال کئے ہیں۔ اس ضمن میں سودا، رنگیں، انشا اور محسن کا کوروی کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے۔ لیکن ان حضرات کے کلام میں ہندی عناصر اس قدر کم ہیں کہ فارسیت نے ان کو بالکل دبا دیا ہے۔ **نظیر** نے انشا کی رانی کیتکی کی طرح خالص ہندی زبان میں بہت کچھ لکھا ہے، اس زبان کو کھڑی بولی کہنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ کھڑی بولی سے مراد وہ ہندوستانی ہے جس میں سے عربی فارسی کے الفاظ خارج کر دئے گئے ہوں، یہ زبان ایک درمیانی شکل ہے۔ ایک طرف اردو ہے جس میں عربی فارسی کی آمیزش ہوتی ہے اور دوسری طرف وہ ہندی جس میں سنسکرت کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ جنم کنہیا جی کو **نظیر** اس طرح شروع کرتے ہیں:

ہے ریت جنم کی یوں ہوتی جس گھر میں بالا ہوتا ہے
اس منڈل میں ہر من بھیتر سکھ چین دوبالا ہوتا ہے
سب بات بتھا کی بھولی ہے جب بھولا بھالا ہوتا ہے
آنند منڈیلی باجت ہیں نت بھون اجالا ہوتا ہے

اس کے بعد کنہیا کے جنم کی داستان بیان کرتے ہوئے مختلف ریتوں اور رسموں کا ذکر کیا ہے۔

سب ناری آئیں گوبنے کی اور پاس پڑوسن آ بیٹھیں
کچھ ڈھول مجیرے لاتی تھیں کچھ گیت جچا کے گاتی تھیں
کچھ ہر دم مکھ اس کا بلہاری ہو کر دیکھ رہیں
کچھ تھال پنجیری کے رکھتی تھیں کچھ سونٹھ سٹورا کرتی تھیں

کچھ کہتی تھیں ہم بیٹھے ہیں نیگ آج کے دن کا لینے کو
کچھ کہتیں ہم تو آئے ہیں آنند بدھاوا دینے کو

کوئی گھٹی میٹھی گرم کرے کوئی ڈالے اسپند اور بھوسی
کوئی لائے ہنسلی اور کھڑوے کوئی کرتا ٹوپی میوہ گھی
کوئی دیکھے روپ اس بالک کا کوئی ماتھا چومے مہر بھری
کوئی بھوں کی تعریف کرے کوئی آنکھوں کی کوئی پلکوں کی

کوئی کہتی عمر بڑی ہووے اس بیر تمہارے بالک کی
کوئی کہتی بیاہ بہو لاؤ اس آس مرادوں والے کی

پوری نظم ایسی ہے جسے پڑھ کر ہندوستان کے متوسط طبقے میں ایک بچے کی پیدائش کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ اس وقت جب ہمارے بہترین مثنوی گو اور داستان نگار شاھزادوں کی ولایت کا حال بیان کرنے میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے، **نظیر** نے کنہیا جنم کا حال لکھ کر اپنی عوام دوستی وسعت مطالعه اور جزئیات نگاری کا ثبوت دیا ہے اور زبان میں شروع سے آخر تک کہیں تصنع اور بناوٹ نہیں۔

نظیر کے مقامی رنگ کو ظاھر کرنے والی نظموں میں ایک بلدیو جی کا میله بھی ہے قدرتی طور پر ناظرین کے دل میں یه سوال پیدا ہوتا ہے که آخر **نظیر** نے کیوں خاص طور پر ہندوانه تہواروں اور میلوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس کا جواب یه ہے که مسلمانوں کے تہواروں میں کوئی تقریب ایسی نہیں ہے جس میں

گھر سے باہر میلوں ٹھیلوں میں مردوں اور عورتوں کا مجمع ہوتا ہو اور اس قسم کی کسی اجتماعی تفریح کا سامان ہوتا ہو جیسا ہندؤں کے میلوں میں ہوتا ہے البتہ مزارات کی حاضری اور نوچندی جمعرات کا میلہ یا محرم کے بعض اجتماع اس قسم کے ہوتے تھے جن میں عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں اور ان کا ذکر سرشار کے فسانہ آزاد اور شوق کی مثنویوں میں ملتا ہے لیکن عیش و طرب کا جو انداز ان میلوں میں ہوتا تھا جنکو نظیر نے اختیار کیا ہے وہ اور کہیں نصیب نہیں ہو سکتا تھا ۔

ان میلوں کا تاریخی یا مذہبی پس منظر چاہے کچھ ہو نظیر نے ان کے جس دور کا ذکر کیا ہے اس میں تفریح اور خوش طبعی کے عناصر سب سے نمایاں ہیں، مذہبی رنگ کچھ واجبی سا ہی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ لوگ کسی دیوی یا دیوتا کے درشن کرنے کے بہانے سے دیدہ بازی کے لئے ان میلوں میں شریک ہوتے تھے اور آزاد قماش لوگوں کو پوجا کرنے پرشاد چڑھانے یا آرتی کرنے کی بجائے دھکوں اور پھبتیوں میں لطف آتا تھا، میلوں کی رونق ان بیشمار دوکانوں سے دوبالا ہوتی تھی جن میں خوبان روزگار کے لئے زیبائش و آرائش کا سامان اور زبان کا چٹخارہ رکھنے والوں کے لئے طرح طرح کی نعمتیں مہیا ہوتی تھیں، ان ہنگاموں میں کہیں راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں - کہیں عہد و پیمان ہیں کہیں شکوے شکایتیں اور کہیں مزے مزے کی گھاتیں - ایسی بھیڑ میں کسی کی پگڑی اتر جاتی ہے اور کسی کی جیب کٹ جاتی ہے - کوئی اچکا کسی کی گٹھڑی لے بھاگتا ہے اور اس کے پیچھے دوڑیو لیجئو پکڑیو کی پکار ہوتی ہے۔ بعض میلوں اور تماشوں میں بڑوں کے ساتھ بچے بھی شریک ہوتے ہونگے لیکن جس ماحول کو نظیر ان میلوں کے وسیلہ سے پیش کرنا چاہتے تھے اُن میں بچوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں نکلتی، شاید اسی لئے بلدیو جی کے میلہ میں بچوں کا ذکر نہیں ملتا اور نہ دوکانوں وغیرہ کے ذکر میں ان کے کھیل کھلونوں کا ذکر

ملتا ھے۔ ایسی تفصیلات دیکھنا ھوں تو دیوالی دیکھئے جس میں کھیلوں کھلونوں۔ بتاشوں اور کھانڈ کے کھلونے کا ذکر کیا گیا ھے۔ بلدیو جی کے میلے میں پہلے خلقت کے ھجوم اور دوکانوں کی رونق کا عالم دیکھئے :—

اتنے لوگوں کے ٹھٹھ لگے ھیں آہ
جو کہ تل دھرنے کی نہیں ھے جا
ے کے مندر سے دو دو کوس لگا
باغ و بن بھر رھے ھیں سب ھر جا
ھیں ھزاروں بساطی اور سوداگر
لاکھوں بکتے ھیں گہنے اور مالا
بھیڑ، انبوہ اور دھرم دھکا
جس طرف دیکھئے آھا ھا ھا

رنگ ھے روپ ھے جھمیلا ھے
زور بلدیو جی کا میلا ھے

بسکہ آمڈے ھیں خلقتوں کے دل
جا بجا پھر رھے جر جنگل
چوک بازار، فوج اور دنگل
جنگلوں میں ھیں مچ رھے منگل
کوئی انبوہ میں رھا ھے کچل
کوئی دھکوں میں کر رھا مل دل
کتنے کرتے ھیں جست کود اچھل
کتنے کرتے ھیں سور چھل جھل جھل
رنگ ھے روپ ھے . . . . . .

ھیں ھزاروں ھی جنس کے ھٹے
موتی، مونگا، اور آرسی، بٹے
پیڑے، لڈو جلیبی اور گٹے
کوے، نارنگی، سنگترے۔ کھٹے

کوئی تو کر رہا ہے چھل بٹے
کوئی چڑھاتا ہے کھیر کے چٹے
پر ہیں مندر کے کوٹھے اور اٹے
بوڑھے، لڑکے جوان اور کٹے
رنگ ہے روپ ہے..............

لگ رہی بھیڑ اس قدر ٹھٹھ ہو
راہ آگے کو اور نہ پیچھے کو
جو جہاں تھا وہیں پھنسا پھر وہ
جس کو کھینچے ہیں گر پڑے ہے وہ
بیٹھے کہتے ہیں کھا کے دھکوں کو
جے مہا راج رام رام بھجو
اور گنور دل پکار کر ہو ہو
اب تو لٹھ وار ہے لگانے کو
رنگ ہے روپ ہے...............

میلے کا دوسرا پہلو حسینوں کا مجمع اور راگ رنگ کی مجلسیں ہیں۔

ہر طرف گلبدن رنگیلے ہیں
نک پلک غنچہ لب سجیلے ہین
بات کے ترچھے اور کٹیلے ہیں
دل کے لینے کو سب ہٹیلے ہیں
خشک، تر، نرم، سوکھے، گیلے ہیں
ٹیڑھے، بلدار اور نکیلے ہیں
جوڑے بھی سرخ سبز پیلے ہیں
پیارے الفت، بہانے، حیلے ہیں
رنگ ہے روپ ہے..............

نازنین ہیں وہ سانوری گوری
جن کی نازک ہر اک پری پوری

کر کے چتون نگاہ کی ڈوری
دل کو چھینے ہیں سب بسر زوری
دھوم ناز و ادا جھکا جھوری
برج میں جیسے مچ رہی ہوری
گھونگھٹوں میں ہیں کر رہی چوری
چوری کیسی کہ صاف سر زوری
رنگ ہے روپ ہے ....

اس بیان میں حسینوں کی تصویریں ساکت اور بیجان مرقعوں کی طرح نہیں بلکہ ان میں زندگی کی حرکت اور جوانی کی شوخی موجود ہے۔ اس حرکت اور شوخی کو

ع برج میں جیسے مچ رہی ہو رہی

کہہ کر بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہ تشبیہہ خالص مقامی ہے بلکہ ایسی جامع ہے کہ راگ رنگ اور حرکت کے تصور کو جس خوبی سے ادا کر دیتی ہے کہ وہ کسی اور ذریعے سے ممکن نہ تھا، نظیر کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اس قسم کی تشبیہیں اور تلمیحات اکثر استعمال کرتے ہیں جن میں حرکت اور زندگی کی بعینہ تصویر ملتی ہے۔

اس عام منظر کے بعد محاکات کی ایسی مثالیں دیکھئے جن میں جزئیات نگاری کا کمال بھی موجود ہے۔ اسی حسینوں کے مجمعے میں سے بعض کو نظیر انتخاب کرتے ہیں۔

کوئی چنچل چلے ہے ٹھمکی چال
کچھ وہ پتلی کمر وہ لنبے بال
آنکھوں میں جس کی نشے رنگ کے لال
دھرے ساکھن کے ہاتھوں اوپر تھال
کچھ وہ پوشاک کچھ وہ حسن و جمال
مالنوں کا زیادہ ان سے کمال

ڈال دیں ھار کا گلے میں جال
بدھی ھو کر لیں صاف دل کو نکال
رنگ ھے روپ ھے...............

اس بند سے جو مکمل تصویر سننے والے کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ھے اس کی مزید تفصیل کی ضرورت نہیں ۔ یہ بات البتہ قابل غور ھے کہ اس سراپا نگاری میں **نظیر** نے کہیں اس قسم کی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا ھے جو اردو کے قدیم شعرا کی سراپا نگاری میں عام طور پر ملتا ھے۔ اور شاید اسی لئے اس میں تشبیہات کا استعمال نہیں ھے۔ چال کو صرف ٹھمکتی چال کہا ھے۔ اسے ھنس کی چال ، کبک دری یا فتنہ قیامت نہیں بتایا ھے۔ کمر کو صرف پتلی کہا ھے ایسے 'مو' یا عدم نہیں سمجھا ھے۔ بالوں کی سیاھی اور درازی کے لئے شاعر کو تشبیہ اور استعارے کے کنوئیں جھانکنے نہیں پڑے وہ صرف لانبے بال کہہ کر گزر جاتا ھے اور نقش کی تکمیل سننے والے کے تصور پر چھوڑ دیتا ھے۔ آنکھ کے ذکر میں آھوئے وحشی ، اور مے خانہ کے مضامین کی تلاش اسے آوارہ نہیں کرتی وہ صرف ان کی لالی کا ذکر کرتا ھے جیسی عام طور پر نشے کے استعمال سے آنکھوں میں پیدا ھو جاتی ھے۔ پوشاک اور حسن و جمال کی اور تفصیلات بھی نہیں ھاں اتنا ضرور معلوم ھوتا ھے کہ وہ پھولوں کا گہنا پہنے ھے ۔

جسم کے مختلف اعضاء میں سے صرف کمر کا ذکر اور اس کے ساتھ آنکھوں کی سرخی کا بیان **نظیر** کی ایک خاص ذھنی اور نفسیاتی کیفیت کا غماز ھے۔ ان دونوں چیزوں میں ایک قسم کی جنسیت پائی جاتی ھے اور **نظیر** کے بیان سے ان کی جنسی محرومی ظاھر ھے ۔ لیکن یہ دونوں باتیں اس قدر پردے میں ھیں کہ الفاظ کی مدد سے تحلیل نفسی کئے بغیر عام پڑھنے والا ان سے گزر جاتا ھے۔ عیش و عشرت کی فراوانی کا حال سنئے :

ناچ اور رنگ کے دھڑاکے ھیں
گھنگھرو اور تال کے جھناکے ھیں
نقلیں ، نصبے ، کہانی ، ساکے ھیں
کھنڈ ، دوھرے کبت کتھا کے ھیں

کہیں آغوش کے لپا کے ہیں
کہیں بوسوں کے سو جھپا کے ہیں
رنگ ہے روپ ہے...... ....
کوئی کمہاری کے کر رہا ہتھ پھیر
کوئی کاچھن کے چن رہا ہے بیر
کوئی کنجڑی سے لڑ رہا منہ پھیر
کوئی بنئے کو مارتا ہے سمیر
رنگ ہے روپ ہے..............
سینکڑوں رنگ رنگ کی چھڑیاں
پھول گیندوں کے ہار کی لڑیاں
کہیں چھوٹیں انار پھلجھڑیاں
کہیں کھلتی ہیں دل کی گلچھڑیاں
کہیں الفت سے انکھڑیاں لڑیاں
کہیں باہیں گلے میں ہیں پڑیاں
عیش و عشرت کی لٹ رہی دھڑیاں
دال موٹھیں، منگوچھی اور بڑیاں
رنگ ہے روپ ہے..............

اس میں ایک منظر بڑا مزیدار ہے۔

ٹوٹے پڑتے گنواری اور گنوار
جس گنواری کو چلئے دھکا مار
گرکے دے گالی یوں کہے ہے پکار
کیسو اٹھلا چلے ہے داری جار

آخری مصرعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ **نظیر** کو مختلف لوگوں کی زبان اور محاورہ پر کتنا عبور تھا اور غالباً یہ کہنا زیادہ غلط نہیں ہے کہ خالص بیان و سرمایہ زبان (Diction) کے اعتبار سے اردو کے قدیم و جدید شعرا میں **نظیر** کا کوئی حریف نہیں بن سکتا، تفصیل اس کی اپنے موقع پر آئی ہے۔

میلوں ٹھیلوں کے مقامی رنگ، سے قطع نظر **نظیر** کی رگ و پے میں اپنے ماحول کی محبت ایسی رچی ہوئی تھی کہ ان کے موضوعات کے انتخاب میں ہر جگہ اس کا ثبوت موجود ہے۔ میں یہاں خاص طور پر **نظیر** کی ان نظموں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ہندوستان کے موسموں، پھلوں، ترکاریوں، میووں اور مٹھائیوں سے متعلق ہیں آردو ادب کی تاریخ میں لاہور کے اس یادگار مناظمہ کو ایک سنگ میل قرار دیا جاتا ہے جس میں کرنل ہالرائڈ کی تحریک پر غزل کے ایک مصرعہ کی بجائے ایک موضوع شعرا کو طبع آزمائی کے لئے دیا گیا تھا اور حالی اور آزاد نے برسات پر نظمیں لکھی تھیں، اس مجلس کی اہمیت سے مجھے انکار نہیں کیونکہ اس نے غزل گوئی کی روایت پر جس نے مسلسل بیانیہ شاعری کے انداز کو پنپنے نہیں دیا تھا پہلی کاری ضرب لگائی، لیکن آزاد اور حالی کی یہ بات ایسی نہیں کہ اس سے ہماری شاعری بالکل نا آشنا تھی، سلطان محمد قلی شاہ کی کلیات موجود ہے جس میں ہندوستان کے موسموں، پھلوں، میووں اور باغوں پر نظمیں شامل ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ جب غزل اپنے شباب پر پہنچی تو شعراء کی تمام تر توجہ اسی صنف پر محدود ہو گئی، یا پھر قصیدے، مثنویاں اور مرثیے لکھے گئے لیکن رواج اور عام مقبولیت کے اعتبار سے ان میں سے کوئی صنف غزل کے مقابلہ میں آگے نہیں بڑھتی، **نظیر** جو ہر ہر پہلو سے روایت شکن ہیں اس بارہ میں ان روایات کی تجدید کرتے ہیں جو قلی قطب شاہ کے یہاں ان سے بہت پہلے پہلی مرتبہ نمایاں ہوئی تھیں ان میں ایک نظم آگرے کی ککڑی کی تعریف میں ہے۔ ککڑی ایسا پھل یا ترکاری نہیں جیسے ہندوستان کا خاص تحفہ کہیں لیکن آگرہ کی سخت کوهستانی گرمی میں جنھوں نے ان نرم و نازک ٹھنڈی ککڑیوں کو دیکھا اور کھایا ہے وهی **نظیر** کی اس نظم کا لطف لے سکتے ہیں۔

پہونچے نہ اس کو ہرگز کابل درے کی ککڑی
نے پورب اور نہ پچھم خوبی بھرے کی ککڑی

نے چین کے پرے کی اور نے ورے کی ککڑی
دکھن کی اور نہ ہر گز اس سے پرے کی ککڑی
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

کیا پیاری پیاری میٹھی اور پتلی پتلیاں ہیں
گنے کی پوریاں ہیں ریشم کی تکلیاں ہیں
فرہاد کی نگاہیں، شیریں کی ہنسلیاں ہیں
مجنوں کی سرد آہیں لیلیٰ آنکلیاں ہیں

کیا خوب.........................

کوئی ہے زرد مائل کوئی ہری بھری ہے
پکھراج منفعل ہے، پنے کو تھر تھری ہے
ٹیڑھی ہے سو تو چوڑی وہ ہیر کی ہری ہے
سیدھی ہے سو وہ یارو رانجھا کی بانسری ہے

کیا خوب.........................

نظیر کے مقامی رنگ کا اندازہ ان اشعار سے ہوسکتا ہے کہ تشبیہات کی تلاش میں فرہاد و شیریں اور لیلیٰ و مجنوں کے ساتھ اس کا ذہن فوراً ہیر اور رانجھا کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ہیر کے ہندوستانی تصور کو ہری چوڑی سے واضح کیا ہے اور ٹیڑھی ککڑی جو خم کھا کر ہلال بن جاتی ہے۔ دور سے دیکھنے والے کو واقعی سبز چوڑی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح سیدھی ککڑی کو رانجھا کی بانسری بتایا ہے۔ تشبیہ میں ندرت بھی ہے اور تازگی بھی، بیساختہ پن بھی ہے اور سادگی بھی۔

میٹھی ہے جس کو برفی، کہئے گلابی کہئے
یا حلقے دیکھ اس کے تازی جلیبی کہئے
تل شکریوں کی پھانکیں یا اب امرتی کہئے
سچ پوچھئے تو اس کو دندان مصری کہئے

کیا خوب.........................

ان تشبیہات میں بھی وھی انداز ھے جس کا ذکر اوپر کیا گیا، اب ان ککڑیوں کے کھانے کا مزہ چکھئیے :

چھونے میں برگ گل ھے کھانے میں کرکری ھے
گرمی کے مارنے کو اک تیر کی سری ھے
آنکھوں میں سکھ کلیجے ٹھنڈک ھری بھری ھے
ککڑی نہ کہئیے اس کو ککڑی نہیں پری ھے

کیا خوب.........................

رسمی اور فرسودہ تشبیہات میں بھی نظیر ایک نئی جان ڈال دیتے ھیں، محبوب کی زلف اور اس کی کلائی کی بہت سی تشبیہات آپ نے پڑھی ھونگی ذرا نظیر کا رنگ دیکھئیے :

بیل اس کی ایسی نازک جوں زلف پیچ کھائی
بیج ایسے چھوٹے چھوٹے خشخاش یا کہ رائی
دیکھے اس کی نرمی باریکی اور کلائی
آتی ھے یاد ھم کو محبوب کی کلائی

کیا خوب نرم نازک ....

جدت آفرینی کا رنگ کڑوی ککڑیوں کے بیان میں دیکھئیے :

مشہور جیسی ھرجا یاں کی جالیاں ھیں
ویسی ھی ککڑی نے بھی دھومیں یہ ڈالیاں ھیں
میٹھی ھیں سو تو گویا شکر کی تھالیاں ھیں
کڑوی ھیں سو بھی گویا خوبان کی گالیاں ھیں

کیا خوب نرم نازک ... ...

تشبیہات کی جدت اور ندرت تو ان میں ھے ھی لیکن وطن اور وطن کی ھر چیز سے محبت کی جس شدت کا اظہار ھے وہ بھی کم اثر آفرین نہیں۔ اس سلسلے کی دوسری نظم ''تربوز'' پر ھے۔ آگرہ کی سخت گرمی میں تربوزوں پر جو بہار ھوتی ھے اس کا لطف کچھ دیکھنے والے ھی جانتے ھیں، اس نظم میں میاں نظیر کی فطری خوش طبعی بھی اپنا رنگ دکھاتی

ہے۔ تربوز کھانے کے بعد یار دوستوں میں جو مارپیٹ ہوتی ہے۔ اس کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا گیا ہے۔ ممکن ہے اس نظم پر بھی بعض لوگوں کو عامیانہ پن کا اعتراض ہو، یہ صحیح ہے کہ جن چہلوں کا اس میں ذکر کیا گیا ہے وہ ثقہ طبیعتوں کو ناگوار گزرتا ہوگا لیکن بے تکلف یار دوستوں کے مجمعوں میں جو حالت گزرتی ہے اور جلسوں میں جو کیفیات پیش آتی ہیں ان کو نظیر نے بڑی صحت اور صفائی سے نظم کردیا ہے:

کیوں نہ ہو سبز زمرد کے برابر تربوز
کرتا ہے خشک کلیجہ کے تئیں تر تربوز
دل کی گرمی کو نکالے ہے یہ اکثر تربوز
جس طرف دیکھئے بہتر سے ہے بہتر تربوز
اب تو بازار میں بکتے ہیں سراسر تربوز

تربوز کے کھانے کی مختلف صورتیں ملاحظہ ہو:

کتنے کھاتے ہیں نزاکت سے تراش اس میں دھر
تا کہ سینہ ہو خنک، سردی میں ٹھنڈا ہو جگر
کتنے شربت ہی کے پیتے ہیں کٹورے بھر بھر
کتنے بیجوں کو پھنکتے ہیں خوشی ہو ہو کر
کتنے کھاتے ہیں کفایت سے منگا کر تربوز

تربوز کی خوبیاں بس دو ہیں، میٹھا ہو اور سرد ہو۔

میٹھے اور سرد ہیں اتنے کہ ذرا نام نہ لے
ہونٹ چپکے ہیں جدا دانت ہیں کر کر بجتے
شب کو دو چار منگا کر جو تراشے میں نے
کیا کہوں میں وہ مٹھائی میں کہ کیسے نکلے
کوئی اولا، کوئی مصری، کوئی شکر تربوز

اسی تربوز کی بدولت محبوب کو شوخی کا ایک نیا بہانہ ہاتھ آتا ہے:

پیار سے جب ہے وہ تربوز کبھی منگواتا
چھلکا اس کا مجھے ٹوپی کی طرح دے ہے پہنا
اور یہ کہتا ہے کہ پھینکا تو چھکادوں گا مزا
کیا کہوں یارو میں اس شوخ کے ڈر کا مارا
دو دو دن رکھے ہوئے پھرتا ہوں سر پر تربوز

اسی نظم میں **نظیر** نے ایک نہایت نادر اور اچھوتی اور اس کے ساتھ ہی نہایت جاندار تشبیہ استعمال کی ہے :

ایک بے درد ستم گر ہے وہ کافر خوانخوار
قتل کرتا ہے عزیزوں کے تئیں لیل و نہار
کل مرا اس کی گلی میں جو ہوا آکے گزار
اس طرح سر کا شہیدوں کے پڑا تھا انبار
جیسے بازار میں تربوز کے اوپر تربوز

جن حضرات نے **نظیر** کے علاقے میں تربوزوں کا بازار دیکھا ہے اس تشبیہ سے پوری طرح وہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ وہاں تربوز میوہ فروشوں کی دوکانوں پر آراستہ ٹوکریوں اور الماریوں کی جگہ زمین پر ڈھیر کردئے جاتے ہیں۔ بلا کسی ترتیب کے ایک تربوز کے اوپر دوسرا تربوز ہوتا ہے۔ سب ہی قسم کے چھوٹے بڑے سینکڑوں بلکہ ہزاروں تربوز ہوتے ہیں جو ایک دوسرے پر پڑے ہوتے ہیں کہ ایک انبار معلوم ہوتا ہے۔ کچھ ان میں سے کھلے ہوتے ہیں جن کا سرخ رنگ دور سے رنگ شہیدان اور جن کے چکمدار بیج دندان خندہ نما معلوم ہوتے ہیں **نظیر** کا خیال اس منظر کو دیکھ کر ایک ایسے سفاک قاتل کی طرف منتقل ہوتا ہے جو بلا روک ٹوک کے اپنے عشاق کو قتل کرتا ہے۔ ان میں بے گنہ، گنہ گار، وفا شعار، بے وفا جوان، بوڑھے، چھوٹے بڑے کسی کی تمیز نہیں ہوتی، ان کے سروں کا ڈھیر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے تربوزوں کا ڈھیر لگادیا ہو۔ ہر چند محبوب کو قاتل بنانا ایک رسمی مضمون ہے اور اس میں کوئی تازگی نہیں لیکن **نظیر** کی تشبیہ کی تازگی اور ندرت میں کلام نہیں۔

اس سلسلے کی تیسری نظم ''تل کے لڈو'' ہے، تل کے لڈوں میں بظاہر کوئی ایسی بات نہیں آتی کہ کوئی شاعر اسے اپنی نظم کا موضوع بنائے، لیکن اس کا ایک پہلو قابل غور ہے جس نے **نظیر** کو عوامی شاعر ہونے کے سبب خاص طور پر متوجہ کیا ہوگا۔ تل کے لڈو تاثیر کے اعتبار سے گرم ہوتے ہیں اور جاڑوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس موسم میں امرا طرح طرح کے حلوے، معجونیں اور مقویات و میوہ جات استعمال کرتے ہیں۔ غریبوں کو سوائے گڑ اور تل کے لڈووں کے اور کچھ نصیب نہیں ہو سکتا۔ ان کے نزدیک شاہی سوھن حلوا کہو حبشی حلوا کہو۔ یا قوتی یا معجون کہو یہی تل کا لڈو ہے۔ بقول **نظیر**:

عمدوں نے سو طرح کے یاقوتیاں بنائیں
لوگوں نے دار چینی شکر میں لے ملائیں
سردی میں دولتوں نے سر گرم چیزیں نہائیں
اوروں نے دال مصری گڑ بندیاں بنائیں
ہم نے بھی گڑ منگا کر بندھوائے تل کے لڈو

غریبوں کے لئے انہیں تل کے لڈوؤں میں بادام اور چھوارے کا مزا ہے:

رکھ خوانچے کو سر پر پیدا ہوں پکارا
بادام بھونا چاہو اور کرکرا چھوارا
جاڑا لگے تو اس کا کرتا ہوں میں اجارا
جس کو کہ بچہ یارو سردی نے ہووے مارا
تو دام دے وہ مجھ سے لے جائے تل کے لڈو

نظم کے آخر میں **نظیر** پھر ایک مرتبہ اپنے خاص رنگ پر آجاتے ہیں:

جاڑے میں جس کو ہر دم پیشاب ہے ستاتا
اٹھیں تو جاڑا لپٹے نہیں موت نکلا جاتا
ان کی دوا بھی کوئی پوچھو حکیم سے جا
بتلائے کتنے نسخے پر ایک بن نہ آیا
آخر علاج اس کا ٹھہرائے تل کے لڈو

جو غریب تل کے لڈوؤں کو بادام اور چھوار سمجھیں وھی مٹی کے کورے برتن کی قدر جان سکتے ھیں ۔ پانی پانی ھی ھے چاھے اسے جام سفال میں پی لو اور چاھے روپہلے سنہرے گلاسوں میں یا جام بلورین میں ، لیکن جاموں کا فرق اپنی جگہ پھر بھی قائم ھے ۔ نظیر بیچارے کو نہ خس خانے میسر تھے اور نہ شورے کی جھلائی ھوئی جست کی سرد صراحیاں جو ان کے زمانے میں امیروں کو چلچلاتی دھوپ اور سخت گرمی میں بھی برف سے زیادہ ٹھنڈا پانی پلانے کے لئے تیار کی جاتی ھیں اور نہ وہ ان خوش نصیب شاھی خاندانوں میں تھے جن کے لئے ڈاک کے انتظام کے ساتھ برفانی علاقوں سے برف مہیا کی جاتی تھی اور محلوں میں اس کے ذخیرے رھتے تھے ۔ ان کا تعلق عوام کے اس طبقہ سے تھا جن کے لئے کورے برتن سے بہتر اور کوئی موسم گرما کا تحفہ نہیں ھوتا ھے ۔ ایک آنے کی خریدی ھوئی گولی اپنے ٹھنڈے پانی سے گرمی زدہ سینے میں تازگی کی روح ڈالنے کو کافی تھی ، اس نظم کے سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ھے کہ آگرہ کے مٹی کے برتن اور کھلونے خاص طور پر صراحیاں اور جھجھریاں دور دور مشہور تھیں اور یہ شہرت اب تک ان کو حاصل ھے :

کورے برتن ھیں کیاری گلشن کی
جس سے کھلتی ھے ھر کلی تن کی
کیا وہ پیاری صدا ھے سن سن کی
بوند پانی کی ان میں جب کھنکی
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

نظیر کے یہاں صوتی آھنگ خاص طور پر قابل لحاظ ھے ۔ اس بند میں کثرت سے ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ھیں جو کورے برتن کی کھن کھن سے ھم آھنگ ھیں اور قطع نظر معنوی خوبیوں کے محض صوتی آھنگ کے اعتبار سے بھی فنکارانہ ھیں :

کورے کوروں کو دیکھ عالم میں
کوزے مصری کے بھر گئے غم میں

یوں وہ رہتے ہیں آب کے نم میں
جیسے ڈوبے ہوں پھول شبنم میں

تازگی جی کی..............

یہاں پھر نظیر کا وہی کمال نظر آتا ہے کہ پرانی تشبیہات کو نئے محل اور موقع سے استعمال کرکے اس میں نئی جان ڈال دیتے ہیں:

وہ جو کورا سفید جھجھر ہے
جس کی جاگیر ملک جھجھر ہے
بیل بوٹے سے اس جھمک پر ہے
تاش، کمخواب یا مشجر ہے

تازگی جی کی..............

کورے برتنوں کے عام گھریلو مصرف کے علاوہ اور بھی کام ہیں، مثلاً:

جتنے نذر و نیاز کرتے ہیں
اور جو پیروں سے اپنے ڈرتے ہیں
جب کہ لا پھول پان دھرتے ہیں
وہ بھی کوری ہی ٹھلیاں بھرتے ہیں

تازگی جی کی..............

خاک سے جب کہ ان کو گڑھتے ہیں
بندگی سے یہ اپنی بڑھتے ہیں
کوروں پر پھول ہار چڑھتے ہیں
حور و غلمان درود پڑھتے ہیں

تازگی جی کی..............

نظیر ہر اعتبار سے عوامی شاعر ہیں کہ انھوں نے یہاں عوام کی نذر نیاز اور پھول ہار چڑھانے کی ان رسموں کا بھی ذکر کردیا ہے جن کا مذہب میں جواز ہو یا نہ ہو عوام کے عقیدہ میں دخل ضرور تھا۔

نظیر بستی تاج گنج میں رہتے تھے، جمنا اس علاقہ کے قریب سے بہتی بلکہ روضہ کو چھوتی گذرتی ہے جب دریا طغیانی پر ہو تو موجیں

روضہ کے زیریں حصہ سے آ آکر ٹکراتی ہیں۔ ایسے زمانے میں آگرہ میں تیراکی کا ایک میلہ ہوتا ہے۔ یہ میلہ بھی کچھ عوامی رنگ رکھتا ہے جس میں ثقہ پوشوں کا گزر نہیں ہوتا، شہر بھر کے خوش طبع نوجوان، مرد عورتیں اس میلے کی بہار دیکھنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ دریا کے کنارے میلوں تک گھاٹ بنے ہیں۔ یہیں سے تیرنے والے دریا میں کودتے ہیں۔ تماشا دیکھنے والے کنارے پر کھڑے ہوتے ہیں ان کے ساتھ سینکڑوں دوکانیں ہوتی ہیں اور جگہ جگہ راگ و رنگ کی محفلیں جمتی ہیں۔ ان مجلسوں میں عوام کے زندہ دل دھڑکتے ہوئے ملتے ہیں۔ زندگی تکلف اور تصنع کی زنجیروں سے آزاد ہوتی ہے۔ مصنوعی اخلاق اور آداب سب غرق دریا ہو جاتے ہیں۔ نظیر کی افتاد طبع نے ان کو ضرور ان میلوں میں کھینچا ہوگا چنانچہ ایک نظم میں ایک ایسے ہی میلہ کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

جب پیرنے کی رت میں دلدار پیرتے ہیں
عاشق بھی ساتھ ان کے غمخوار پیرتے ہیں
بھولے سیانے ناداں، ہشیار پیرتے ہیں
پیر و جوان و لڑکے عیار پیرتے ہیں

ادنیٰ، غریب و مفلس زر دار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار تیرتے ہیں

باغ حلیم اور جوشیو داس کا چمن ہے
ان میں جگہ جگہ پر مجلس ہے انجمن ہے
میوہ، مٹھائی، کھانے اور ناچ دل لگن ہے
کچھ پیرنے کی دھومیں کچھ عیش کا چلن ہے

ہر اک مکان میں ہوکر ہشیار تیرتے ہیں
اس آگرے میں.................

تر بینی میں اہا اہا ہوتی ہیں کیا بہاریں
خلقت کے ٹھٹھ ہزاروں پیراک کی قطاریں

پیریں ، نہاویں ، اچھلیں ، کودیں ، لڑیں، پکاریں
لیتے وہ چھینٹ غوطے کھا کھاکے ھاتھ ماریں

کیا کیا تماشے کر کر اظہار پیرتے ھیں
اس آگرے میں . . . .

جمنا کا پاٹ گویا صحن چمن ہے بارے
پیراک اس میں پیریں جیسے کہ چاند تارے
منہ چاند کے سے ٹکڑے تن گورے پیارے پیارے
پریوں سے بھر رھے ھیں منجھدار اور کنارے

کچھ وار پیرتے ھیں کچھ پار پیرتے ھیں
اس آگرے میں . . . .

تیرنے والوں کے مختلف کرتب بیان کرتے ہوئے لکھتے ھیں:

جاتے ھیں ان میں کتنے پانی پہ صاف سوتے
کتنوں کے ھاتھ پنجرے کتنوں کے سر پہ طوطے
کتنے پتنگ، اڑاتے، کتنے سوئی پروتے
حقوں کو دم لگا کے ھنس ھنس کے شاد ھوتے

سو سو طرح کا کر کر بستار پیرتے ھیں
اس آگرے میں . . . .

ناؤ میں وہ جو گرو ناچوں میں جھک رھے ھیں
جوڑے بدن میں رنگیں، گہنے چمک رھے ھیں
تانیں ھوا میں اڑتی ، طبلے کھڑک رھے ھیں
عیش و طرب کی دھومیں پانی چھپک رھے ھیں

سو ٹھاٹھ کے بنا کر اطوار تیرتے ھیں
اس آگرے میں . . . .

ھر آن بولتے ھیں سید کبیر کی جے
پھر اس کے بعد اپنے استاد پیر کی جے

مور و مکڑ کنھیا جمنا کے ھیر کی جے
پھر غول کے سب اپنے خرد و کبیر کی جے
ھر دم یہ کر خوشی کی گفتار پیرتے ھیں
اس آگرے میں . . . .

جن حضرات نے اکبر کی ترجمہ نظم دریا کی روانی پڑھی ھے انھیں خیال ھوگا کہ حضرت اکبر نے الفاظ کے آھنگ سے دریا کی روانی، اس کے بڑھتے ھوئے جوش اور غیض و غضب کا سماں باندھ دیا ھے اس کا مقابلہ نظیر کی یہ نظم نہیں کرتی، لیکن یہاں نظیر کا مقصد دریا کی روانی، یا اس کی طوفانی موجوں کا نقشہ کھینچنا نہیں تھا، وہ صرف عیش و عشرت کی ایک فضا دکھانا چاھتے ھیں اور ان الفاظ سے ان کا مقصد بخوبی حاصل ھوگیا ھے۔ جھک، جھمک، چھپک کھڑک وغیرہ الفاظ سے ویسا ھی صوتی آھنگ پیدا ھوگیا ھے جیسا نظیر اپنے مضمون سے پیدا کرنا چاھتے ھیں ۔ اردو شاعری میں ایسی مثالیں بہت کم ھیں جہاں مقامی میلوں ٹھیلوں پر طبع آزمائی کی گئی ھو اور یہ اعتراض ایک حد تک بجا ھے کہ اس ابتدائی دکھنی دور کو نظر انداز کردیں جس میں مقامی رنگ موجود تھا تو پھر ھمارے باقی شعرا کا تخیل یا تو صحرائے نجد میں بھٹکتا پھرتا ھے یا پھر بستیوں سے سر ٹکراتا نظر آتا ھے۔ نظیر نے اس سنت کو دوبارہ زندہ کیا جس کی راہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنی مثنویوں میں دکھائی تھی۔ لیکن افسوس کہ نظیر کے بعد یہ شاھراہ ویران ھوگئی اور اس پر صرف بھولے بھٹکے راھی کبھی کبھی نظر آجاتے ھیں۔

اس مقامی ماحول سے ایسے حیات آفریں اور حیات پرور چشمے پھوٹ رھے تھے جن سے شاعری کے نخل کو زندگی کی گرمی اور توانائی مل سکتی تھی لیکن ادبی روایت پرستی نے ھمارے شعرا کو ان چشموں سے دور فریب نظر میں مبتلا رکھا اور ھندوستان میں بھی جیحون اور سیحون، دجلہ اور فرات کی طلب نے انھیں گنگا اور جمنا کے نرمل جل کا مزہ نہ چکھنے دیا۔

اس سلسلہ کو نظیر کی ایک مشہور نظم ''مہادیوجی'' کے بیاہ پر ختم کیا جاتا ہے۔ مہادیو اور پاربتی کے بیاہ کی کہانی ہندو دیومالا کا ایک مشہور قصہ ہے۔ ہمیں یہاں اس کے مذہبی اور تاریخی پہلو سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہندو دیو مالا کے اس قصے کو بیان کرنے میں نظیر نے عام اردو شعرا کی ڈگر سے ہٹ کر کیا انداز اختیار کیا ہے۔ ہندو گھرانوں اور ان کی خانگی زندگی کے بارے میں نظیر نے کیا لکھا ہے اور اس میں کہاں تک صداقت ہے۔

قصہ میں سب سے پہلے ہمارا تعارف پاربتی کے باپ مہاراجہ ہماچل سے اس طرح کرایا جاتا ہے:

گڑھ کوٹ بڑے گر پربت سے اور فوج سپہ کا دنگل تھا
گج ہستی آنچی جھول زری انباری ہودے کنجل تھا
رتھ بہلیں میانہ لال پہ تھیں چنڈول بہ اطلس مخمل تھا
خوشرنگ ترنگا تیز قدم ہر زین جھمکتا ہر پل تھا
سب ساز جڑاؤ گج گاھن کوئی چنچل تھا کوئی کرتل تھا
ہر بستر چپر جھلا جھل کا دھن دوست پلو آنچل تھا
پکھراج زمرد لعل منوں، من مکتا بھی نے اٹکل تھا
محلات سنہرے رنگ بھرے درباری اور سکھ منڈل تھا
کل برتن سونے روپے کے اور چپرا چیری کا دل تھا
باغات بڑی تیاری کے ہر ڈال پہ گل اور پھل تھا
زر زیور ٹھاٹھ اسباب بہت اور عیش خوشی کا بھر دل تھا
گھر جگمگ جگمگ کرتا تھا سکھ چین آنند اور منگل تھا

قصہ دیو مالا کا ہے لیکن زندگی سے اس قدر قریب لایا گیا ہے کہ قاری کے سامنے ایک قدیم ہندو راجہ کی شان و شوکت، دولت و امارت، ساز و سامان کا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ بیان بالکل سادہ ہے لیکن الفاظ کے انتخاب نے ایک خاص صوتی اثر پیدا کردیا ہے اور اس تصویر میں زندگی اور روانی آگئی ہے۔

اس راجہ کی ایک بیٹی پاربتی تھی' ماں باپ کی پیاری اور ناز بھری
آس مرادوں کی مانی' سر پاؤں سے گہنے میں لدی' خوبصورت چنری
اوڑھے سکھیوں کے ساتھ کھیل کود' اور سوانگ میں دن گزارتی -

لب لعل یمن اوز غنچہ دھن تن برگ سمن قد سرو سہی
پوشاک جھلکتی تاش زری ان گنتی پہنے من موتی
وہ کھنکتے کنگن کندن کے وہ بازو چھلے اور مندری
وہ جھانجن بجتی چاندی کی اور جوڑے گھنگرو چوراسی
ماں باپ کی پیاری ناز بھری آنکھوں کے آگے نس دن پھرتی
نت رہتی ہاتھوں چھانوں میں اور مانی آس مرادوں
سکھ بھو جن نورس اور میوے پکوان مٹھائی' دودھ دھی
سو ساٹھ سہیلی ساتھ پھریں ہم‌عمریں بھی بالی بھولی
پیار کریں تن من واریں سنگ کھیلیں جس میں بہلے جی
سب گہنے میں سر پانو لدی بن سوھا سالو اور چنری
کوئی اچھلے کودے سوانگ کرے کوئی ہنس ہنس کرتی اٹھکھیلی
دن رات ہنسیں اور چین کریں ہر آن کی خوبی خوش وقتی

لڑکی جوان ہوئی تو باپ کو شادی کی فکر ہوئی' راجہ اور
رانی دونوں نے مشورہ کیا رانی کا مشورہ کیا' وہ اس قدیم ہندی
تہذیب کی ایک عورت تھی جس کے لئے شوہر کی مرضی ہی سب کچھ
ہوتی تھی' اس کا جواب سنئے :

تم صاحب ہو تم مالک ہو ہے سب سوبھا سب کی اب تم سے
دو حکم پروہت کو اپنے رکھ دھیان سگائی کا اس کے
جوراج پتی گھر اونچا ہو ہر شہر نگر میں جا ڈھونڈے
وہ بر بھی ایسا سندر ہو جو میری گورا کو سوھے
ہے جیسی گورا چندر مکھی ویسا ہی بر اس کا ہووے
یہ بات جو لڑے دونوں میں رکھ من میں اس کو سوچے پڑے

لوگ اس بر کی تلاش میں نکلتے ہیں، چندے آفتاب و چندے
مہتاب ایک شخص ملتا ہے -

جب من کو سکھ آنند ہوئی پھر تھوڑی سی واں کیسر ے
کر ٹیکا اس کا جلد بہت خوش ہوکر ماتھے پر سو ہے

ہندوؤں کے یہاں دستور ہے کہ بر منتخب کرنے کے بعد اس کے ماتھے پر کیسر کا ٹیکہ لگاتے ہیں ۔ مسلمانوں کے یہاں اس کے برعکس ایک دستور ہے کہ عروس کے انتخاب کے بعد رسم حنابندی ہوتی ہے اور گویا شادی کی اس پہلی رسم کے بعد رشتہ پختہ اور مستحکم ہوجاتا ہے ۔

شادی کی خبر جب راجہ کے محل میں پہنچی تو سب عزیز اور رشتہ دار جمع ہوئے خوشیاں منائی گئیں ۔

سب خویش کٹم دل شاد ہوئے اور پرجا کو ہوئی خوشوقتی
گھر بار مندیلی ڈھول بجا آنند و خوشی کی دھوم مچی
کوئی بولی ہردم خوش ہوکر ہو آئی سگائی گورا کی
کوئی گود چڑھا کر کہتی تھی آمیری گورا پاربتی
کوئی آنکھیں چومے پیار کرے کوئی دوڑ بلائیں لیتی تھی

مہادیوجی فقیرانہ وضع قطع میں راجہ کے محل تک پہنچے، یہ رنگ دیکھ کر راجہ اور اہل دربار حیران ہوئے کہ شاہزادی کے لئے اور ایسا بر تلاش کیا، بہر حال امر تقدیر سمجھ کر چپ ہور ہے اور شادی کا انتظام ہوا ۔

بانات قنادیں شمیانے دل با دل تنبو تنوائے
نمگیرے جھالر موتی کے کمخواب مشجر جھلکائے
کل فرش حریر اور دیبا کے خوشرنگ چمکتے بچھوائے
مقیش زری کے لچھے بھی پھر جا گہ جا گہ لٹکائے
گل عطر و گلاب اور پان دھرے کستوری عنبر کے رکھوائے
پھر تھال الائچی لونگوں کے بھر خوب طرح کے چنوائے
چنگیر دھریں سو زیب بھریں اور طرہ ہار بھی گندھوائے
ہر چار طرف تیار کئے اسباب طرب کے ٹھہرائے

شادی ایک ہندو راجہ کے یہاں ہے اس لئے کھانے پینے میں بھی بجائے پلاؤ، زردہ، قورمہ، منجن، کباب کے لڈو پیڑے اور پوریاں ہی

تیار کرائی گئیں - لاکھوں من میدہ - میوہ - گھی - شکر - مصری مہیا ہوئی - کڑھاؤ چڑھے - پیڑوں کے انبار لگ گئے - گلابی - برفی - لڈو - قند - بادام گری ' مگلا - خرمے - امرتی - جلیبی - کھجلے - گھیور - بالوشاھی کے تھال پر تھال اترنے لگے -

جب رات ہوئی تب شیوشنکر خوشوقتی سے اسوار ہوئے
سب آگے پیچھے دولھا کے دلشاد براتی ساتھ چلے
فانوسیں رنگین جھاملیاں اور جھاڑ بڑی گلگاری کے
ہر آن جراؤ چنور ڈھلیں اور سیس کے اوپر چھتر پھرے
وہ پریاں ناچیں تختوں پر پوشاکیں گہنے جھمک رہے
نقارے نوبت طبل نشان الغوزے بجتے اور ڈفلے
ہر سرنا میں دھن میں میں کی اور کرنا ترئی جھانجھ بڑے
کر دھونسے دھوں دھوں باج رہے اور تاشے بجتے کڑ کڑ سے
مردنگ مندیلے تال بجیں اور سارے گھنگھرو بھی جھنکے
وہ ڈھول دھمادھم شور کریں اور جھنے بھی جھم جھم کرتے

غرض اسی طرح جلوس کی پوری تفصیل بیان کی ہے ' برات مہادیوجی کی تھی اس لئے براتی بھی نرالے تھے -

ہر پگڑا ان کا سومن کا اور مڑلے رسوں کے پٹکے
اور پگڑوں پر طروں کی طرح تھے ساکھو بر کے بر رکھے
کوئی ننگے سر بال اس کے جوں بانس بڑے دس گز کے
کوئی منڈ کوئی رنڈا اور کوئی بن پانوں ناچے اور کودے
کوئی ہاتھی رکھے کاندھے پر کوئی اونٹ بغل میں دبکائے
کوئی ارنا بھینسا گود لئے کوئی گینڈا سرپر ہٹھلائے
کوئی سانپ گلے میں لپٹائے پھن ان کے دم بڑے چوئے
کچھ لمبے سونٹے لوہے کے کچھ ہاتھ لئے بھاری لکڑے

برات چڑھ چکی تو ریتیں رسمیں شروع ہوئیں ' پہلے سدھن سے ملاقات ہوئی - پھر ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو شہزادی کی سہیلیوں نے رونمائی کی ' کسی نے بلائیں لیں ' کسی نے پانی اوپر سے وار

کر کے پیا ، براتی اپنے مرتبہ سے بٹھائے گئے ، دولھا دولھن سامنے بیٹھے، پھیروں کی تیاری ہوئی ، پنڈت اور برھمن بلائے گئے، بید پڑھے گئے ، گٹھ جوڑن کی ریت ہوئی ، پہلے گنیش کی پوجا ہوئی ، پھر نوگرھوں کی پوجا ، جواھرات کے بھرے تھال نیگ میں دے گئے ، رسمیں ختم ہوچکیں تو رخصت کا وقت آیا ، ماں باپ کا دل بھر آیا ، بیٹی کو گلے لگایا اور رخصت کیا ۔

یہ شادی ھندو دیومالا کی ایک کڑی ھے لیکن **نظیر** نے اسے اس طرح نظم کیا ھے کہ اس عہد کے کھاتے پیتے ھندو گھرانوں کی شادی بیاہ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ھے۔ دیو مالا کے رنگ کو نکھار نے کے لئے جگہ جگہ عجیب و غریب مناظر سے کام لیا ھے۔ مثلاً براتیوں کا نقشہ جو آپ کی نظر سے گزرا اسی کا ایک حصہ ھے۔

بلدیو کا میلا، مہادیو کے بیاہ اور جنم کنہیا جی کے علاوہ **نظیر** کی کلیات میں اور بھی نظمیں ھیں جو اپنے موضوع کے اعتبار سے خالص ھندوانہ ھیں مثلاً رسم کتھا ، ھر کی تعریف ، مدح نانک شاہ گرو ، گرو گنج بخش ، درگاجی کی درشن ، بھیروں اور کنہیا راس ، ان نظموں کو **نظیر** نے محض رسمی طور پر نہیں لکھا ھے اور نہ صرف ھندی اور سنسکرت کے چند الفاظ استعمال کرکے ھندوانہ رنگ پیدا کرنے کی مصنوعی کوشش کی ھے۔ نظموں کے پڑھنے سے صاف معلوم ھوتا ھے کہ **نظیر** یہاں بھی اپنے موضوع میں پوری طرح ڈوب کر لکھ رھے ھیں اور مسلمان ھونے کے باوجود یہ رنگ ان کی طبیعت میں پوری طرح رچ گیا ھے۔ مسلمانوں نے سنسکرت اور ھندوستانی زبانوں کی جس طرح آبیاری کی ھے وہ ایک الگ مسئلہ ھے لیکن جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ھے وہ نظیر کا خلوص ھے جس کی مثالیں بہت مشکل سے ملیں گی وہ ھندلمانی تمدن (Indo-Muslim culture) جو ھم سب کو ورثہ میں ملا ھے نہ خالص ھندوانہ ھے اور نہ خالص اسلامی ، بلکہ مسلمانوں نے ملکی ماحول کے قدرتی اثرات جب اور جس طرح قبول کئے ھیں ان کی عکاسی کرتا ھے اور دونوں کے ارتباط کا ایک ارتقائی نتیجہ ھے۔

اس ارتباط کو نظیر اپنی شخصیت ، اپنے کلام ' موضوع کے انتخاب اور زبان کے استعمال سے قدم قدم پر ظاہر کرتے ہیں، اس اعتبار سے نظیر کو ایک اور امتیاز بھی حاصل ہو جاتا ہے - جن مسلمان شعرا نے ایرانی شاعری اور اسلامی تمدن کے اثرات زیادہ قبول کئے ہیں یا جن ہندو شعرا نے خالص ملکی فضا اور ہندی زبان کو اختیار کیا ہے عصبیت کے ایک حد تک قابل تعریف جذبہ کو ظاہر کرنے کے باوجود اس ہمہ گیر اثر آفرینی سے محروم ہیں جو نظیر کو حاصل ہوئی ، عوام میں نظیر کے مقبولیت کا راز بھی ایک حد تک اسی میں مضمر ہے ، اعلیٰ طبقوں کے چند افراد سے نیچے اتر کر جو ایک طرف 'مولویانہ' اور دوسری طرف 'پنڈتانہ' رنگ میں ڈوبے. ہوتے ہیں جب ہم عوام کی سطح پر اترتے ہیں تو یہ بعد کچھ کم ہوجاتا ہے ، اسے دیکھنا ہو تو ان میلوں ٹھیلوں میں جانا چاہئے جہاں تکلف ' وضعداری اور رکھ رکھاؤ قریب بھی نہیں آنے پاتے- نظیر نے اپنی زندگی انہیں میں گزاری پھر وہ طبقہ خاص میں کیسے مقبول ہوسکتے تھے -

خالص لسانیاتی نقطہ نظر سے بھی نظیر کے کلام کا یہ حصہ بیحد قابل قدر ہے - دکھنی دور تک اردو میں فارسی کے ساتھ ساتھ مقامی بولیوں کے اثرات خاصے نمایاں ملتے ہیں - اگرچہ اس زمانہ میں فارسی سے بکثرت نثر اور نظم کی کتابیں دکھنی میں ترجمہ یا ماخوذ ہوئیں اور قدرتی طور فارسی کے انداز اور اسالیب نے دکھنی مصنفین کو متاثر بھی کیا لیکن بحیثیت مجموعی کسی مصنف کی تحریرں میں زبردستی فارسی کی آمیزش و آویزش کا رحجان نہیں پایا جاتا ، لیکن ولی کی شہرت کے بعد جب شمالی ہند کے شعرا سنجیدگی سے اردو کی طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے ریختہ کو جو ان کے نزدیک

ایک بات لچرسی بہ زبان دکھنی تھی

بقول خود ''طرز سخن،، سے آشنا کرایا - دکھنی محاورے سے اردو کو پاک کرنے کی کوشش میں شمالی ہند کے شعرا اور ادیبوں نے سب سے زیادہ فارسی کا سہارا لیا ، ایک تو فارسی دلی کی درباری ، علمی

اور ادبی زبان تھی ، دوسرے خوذ آردو میں جو لوگ شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے مثلاً (خان آرزو ، میرزا مظہر جانجانان وغیرہ) وہ خود فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے ، آردو کو '' اعتبار دینے'' کے لئے سوائے اس کے ان کے سامنے اور کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ فارسی الفاظ تراکیب ، تشبیہات اور استعارات سے اس '' بے سایہ'' زبان کو فارسی کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کریں - رھی سہی کمی کو لکھنوی زبان دانوں نے پورا کردیا ، اصطلاح زبان کے نام سے تراش خراش کی جس تحریک کا علم ناسخ اور ان کے شاگردوں نے بلند کیا اس نے ھندی کے سبک اور شیریں عناصر کو بھی اردو سے دیس نکالا دیدیا ، اس سارے طویل عرصہ میں صرف چند لوگ ایسے نظر آتے ھیں جنھوں نے ھندی الفاظ اور تراکیب کا نسبتاً زیادہ استعمال کیا ھے - مثلاً سودا ' اور انشا ، لیکن جہاں کہیں ان دونوں باکمالوں نے ھندی عناصر کو اختیار کیا ھے وھاں یا تو محض تفنن طبع کے لئے یا پھر کوئی خاص فضا پیدا کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ھے - اس پس منظر کو پیش نظر رکھیں . تو نظیر اس وادی میں تنہا خود ھی اپنے رھبر اور خود ھی رھرو ھیں ان کی یہ کوشش نہ مصنوعی ھے نہ پر تکلف ' اس میں وھی زور ھے جو آمد میں ھوتا ھے ، ایسے کسی قسم کی منفی لسانی تحریک بھی نہیں کہہ سکتے - (جیسے کہ بعد میں ھندی ھندوستانی کی شکل میں ظاھر ھوئی) ، نظیر کا یہ کلام اس اعتبار سے خالص ھندوستانی کے معیار پر بھی پورا اتر آتا ھے اور اگر اس کا رسم الخط فارسی کی جگہ دیوناگری کردیا جائے تو اس کے ھندی ماننے میں بھی کسی کو تامل نہ ھوگا ، چنانچہ کلام کا یہ حصہ دیوناگری رسم الخط میں نظیر کے ھندی کے کلیات عنوان سے آگرہ سے شایع بھی ھوا ھے -

اب میں نظیر کے کلام کے ایک نہایت اہم پہلو کا تجزیہ کرنا چاھتا ھوں، یہ ان کی شاعری کا اخلاقی اور انقلابی رجحان ھے۔ نظیر کے بارہ میں شروع سے یہ غلط فہمی پھیلا دی گئی کہ وہ عامیانہ بلکہ سوقیانہ مذاق رکھتا تھا اور اسکا کلام اوباشوں کے لئے لکھا گیا ھے۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ھوا کہ نظیر کے اخلاقی اور انسانی پہلو پر ناقدین نے کبھی سنجیدگی سے غور کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اردو شاعری کی تاریخ میں شاید ھی کوئی دوسرا شخص انسانیت کا اتنا بڑا علمبردار ھوا ھو جتنا نظیر تھا ایسے زمانہ میں جب انسانوں کو امیر اور غریب، شریف اور رذیل۔ کے خانوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور اخلاق کے خود ساختہ اصولوں پر اصل انسانیت کو بھینٹ چڑھایا جارھا تھا، نظیر کا آدمی نامہ، میرے خیال میں ایک غیر معمولی نظم ھے، پہلا بند ملاحظہ ھو :—

دنیا میں پادشاہ ھے سو ھے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ھے سو ھے وہ بھی آدمی
زر دار، بےنوا ھے سو ھے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رھا ھے سو ھے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رھا ھے سو ھے وہ بھی آدمی،

بادشاھی کےخدائی حق کا نظریہ (Theory of the divine right of Kings) جو نہ انسانی ھے نہ اسلامی براہ راست عجمی بنیادوں پر استوار ھے، ایرانی سلطنت ایران کا حقدار صرف آل ساسان کو سمجھتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں یہ عادت سلاطین کو خدا نے عطیہ خاص کے طور پر بخشی تھی، اس عجمی نظریہ نے تاریخ میں جو گل کھلائے میں یہاں ان کی تفصیلات میں جانا نہیں چاھتا لیکن ظل اللہ اور ظل السبحان کا تصور اسی کا براہ راست ثمر تھا، حالانکہ کامل ترین انسان بھی اپنے آپ کو انسانوں میں سے ایک اور مثل آن کے ھی شمار کرتا ھے، اور و جس پر اللہ تعالی نے اپنی نعمتیں تمام کیں اور اس کے واسطے ایک دین کو مکمل کیا وہ بھی ایک انسان ھی ھے۔ انسان

کی مساوات کا یہ تصور جسکا نظریاتی حصول اس عہد کی اشتراکیت اور اشتمالیت کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ھے کوئی نئی بات نہیں، سب انسانوں کی برابری کا سبق اس سے بہت پہلے پڑھایا جا چکا تھا اور ایک قوم نے اپنے عمل سے اسے ثابت بھی کر دیا تھا، شعر و شاعری اور ادب میں بھی بندہ و مولا، آقا و غلام کی تمیز پر خط نسخ پھیرنے کا سہرا جدید ادب کے سر پر نہیں جگمگا رہا ھے اور اگر ترقی پسند ادب کا یہ بنیادی طرہ امتیاز ھے تو اردو ادب میں سب سے پہلے نظیر اس شرف کے مستحق ھیں اور نظیر کا آدمی نامہ اس ادب کا پہلا منشور ھے،

سلطان اور رعایا سے آگے بڑھ کر امیر و غریب دولت مند و مفلس سرمایہ‌دار اور مزدور کے طبقاتی امتیازات بھی نظیر کے بقول بالکل سطحی اور اتفاقی ھیں - جہاں تک انسانیت کا تعلق ھے اسکا مظاھرہ ھر کہیں ھو سکتا ھے :—

اک آدمی ھیں جن کے یہ کچھ زرق برق ھیں
روپے کے ان کے پانوں ھیں سونے کے فرق ھیں
جھمکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ھیں
کمخواب، تاش، شال دوشالوں میں غرق ھیں
اور چیتھڑوں لگا ھے سو ھے وہ بھی آدمی

اک ایسے ھیں کہ جن کے بچھے ھیں نئے پلنگ
پھولوں کی سیج ان پہ چمکتی ھے تازہ رنگ
سوتے ھیں لپٹے چھاتی سے معشوق شوخ و شنگ
سو سو طرح سے عیش کے کرتے ھیں رنگ ڈھنگ
اور خاک میں پڑا ھے سو ھے وہ بھی آدمی

نظیر کی شاعری کی عام خصوصیات میں ان کے مشاھدے، جزئیات نگاری اور زندہ دلی کی صفات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ھے، اس نظم میں بھی طرح طرح کے انسانوں کا ذکر ھے ابدال، قطب، غوث، ولی، منکر، کافر، صاحب کشف و کرامات، ریاضت کرنے والے، انتہائی نیک

کردار، اور انتہائی شیطان، راہ راست سے بہکانے والے اور هادی و رهنما سب هی انسان هیں، نظیر هر بند میں ایک هی سلسله کی کڑیاں دکھاتے هیں مثلاً

مسجد بھی آدمی نے بنائی هے یاں میاں
بنتے هیں آدمی هی امام اور خطبه خواں
پڑھتے هیں آدمی هی قرآن اور نماز یاں
اور آدمی هی ان کی چراتے هیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا هے سو هے وہ بھی آدمی

آخری بند یه هے

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر
یاں آدمی مرید هے اور آدمی هی پیر
اچھا بھی آدمی هی کہاتا هے اے نظیر
اور سب میں جو برا هے سو هے وہ بھی آدمی

نظیر کی اخلاقی نظموں میں 'بنجارہ نامه' ایک مشہور نظم هے، اس کا لہجه بیحد حزنیه اور انداز نظیر کی شگفته طبیعت سے مختلف هے - پوری نظم میں ایک قسم کا تمثیلی رنگ قائم رکھا گیا هے - انسان ایک بنجارہ هے جو بستی بستی اور نگر نگر مارا مارا پھرتا هے - اسکا گھر اور وطن کہیں نہیں سارا سازو سامان وہ اپنے ساتھ لا دے پھرتا هے اور کون جانتا هے که کس منزل پر اجل کا قزاق آ کر لوٹ لے، پھر سارا ساز و سامان پڑا رہ جائیگا زن و فرزند، عزیز و اقارب کوئی پاس نہیں پھٹکے گا،

ٹک حرص و هوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے هے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا، بھینسا، بیل شتر، کیا گوئیں پلّا سر بھارا
کیا گیھوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

گر تو ہے لکّھی بنجارہ اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکر، مصری، قند، گری کیا سانبھر، میٹھا کھاری ہے
کیا داکھ، منقے، سونٹھ، مرچ کیا کیسر، لونگ سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تیری ڈھل جاوے گی
ایک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے پاوے گی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوے گی
دھی پوت جنوائی بیٹا کیا، بنجارن پاس نہ آوے گی
سب ٹھاٹھ پڑا . . . .

ایک بند میں غالباً اُن چیرہ دستوں کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے آگرے اور دھلی کے باشندوں پر زندگی دشوار کر رکھی تھی، جنکی تلواروں کی جھنکار نے نیندیں اچاٹ دیں تھیں اور جن کی قوت و شوکت کے سامنے بڑے بڑے سردار سرنگوں ھو جاتے تھے،

مغرور نہ ھو تلواروں پر مت بھول بھروسے ڈھالوں کے
سب ٹپا توڑ کے بھاگینگے منھ دیکھ اجل کے بھالوں کے
کیا ڈبے موتی ھیروں کے کیا ڈھیر خزانے مالوں کے
کیا بغچے تاج مشجر کے کیا تختے شال دوشالوں کے
سب ٹھاٹھ پڑا . . . .

اس نظم کو پڑھنے والے پر دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا بڑا اثر ھوتا ہے ممکن ہے یہ قنوطیت نفسیاتی نقطہ نظر سے ایسے دور میں جب سیاسی خلفشار اور ذھنی ابتری کو دور کرنے کے لئے لوگوں میں ارادے کی مضبوطی، جوش عمل اور ولولہ پیدا کرنے کی ضرورت تھی افادی نقطہ نظر سے زیادہ اچھی نہ سمجھی جائے لیکن یہاں دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ایک تو یہ کہ نظیر خود جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس کی قوت اور عمل کا دائرہ محدود تھا اور شاید نظیر کا ذھن اس طرف آسانی سے منتقل نہیں ھوسکتا تھا کہ اس وقت ادب کے وسیلے سے

جمہور میں ارادے کی مضبوطی، جوش عمل اور ولولہ پیدا کرنے سے ھی ان حالات کی اصلاح ھو سکتی ھے - دوسرے نادری حملے کے قریب اُن کی پیدائش قدرتی طور پر انہیں ایسے دور میں پہنچا دیتی ھے جہاں اتنا بڑا حادثہ گزر چکا تھا کہ لوگ سوچنے اور سمجھنے کی بجائے صرف سہم کر رہ گئے تھے، جب اس قسم کا کوئی شدید حادثہ یا واقعہ پیش آتا ھے تو پہلا نفسیاتی رد عمل ایک حیرت کی شکل میں ھوتا ھے - میں سمجھتا ھوں کہ اس دور میں آئینہ حیرت، اور نقش بدیوار کا جو استعمال شاعری اور ادب میں کثرت سے ھوا ھے وہ اسی کیفیت کی ترجمانی کرتا ھے - جب ایک مدت گزر جاتی ھے تو ذھن حالات کا جائزہ لینے کے قابل ھوتے ھیں - لیکن دلی اور اس کے قرب و جوار میں پے در پے ایسے حادثے گزرتے ھی رھے جنہوں نے لوگوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا، جاٹوں، مرھٹوں اور روھیلوں کے ھاتھوں جو جو ظلم یہاں کے لوگوں پر گزرے اُن کی پکار آج بھی غزلوں کی تشبیہوں اور استعاروں میں دبی دبی سنائی دیتی ھے - یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء کے کے خونی ھنگامہ تک پہنچتا ھے، اس کے بعد کم از کم بظاھر ایک سکون کی صورت نظر آتی ھے اور لوگ اسی کو غنیمت سمجھتے ھیں، یہی وجہ ھے کہ یہاں سے ھماری شاعری اور ادب کے نفسیاتی پس منظر میں ایک ھلکی سی تدریجی تبدیلی شروع ھوتی ھے جو آزاد اور حالی کی نظموں اور پھر سر سید اسکول کی تمام تحریروں میں نمایاں ھوتی ھے یہ ایک الگ موضوع ھے جسکی تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں -

بعض لوگ اس نظم کا مذاق اڑاتے ھوئے کہتے ھیں کہ اس کی لے اور انداز فقیروں کی صدا سے ملتا ھے اور اس کا آھنگ کچھ ایسا ھے جیسے فقیر ڈنڈے یا چمٹے بجا کر نظمیں گاتے پھرتے ھیں یہ بات صحیح ھے لیکن میرے خیال میں اس میں اعتراض کا کوئی پہلو نہیں ھے - یہ نظمیں در اصل بیساختگی کا ایسا نمونہ پیش کرتی ھیں جو شاعروں اور فنکاروں سے ایک الگ دنیا کی ترجمانی کرتے ھیں، ان میں دو باتوں پر زور دیا جاتا ھے ایک تو مضمون کی اثر آفرینی اور دوسرے آھنگ کی وہ لے جو رسمی موسیقی کی بجائے اسکا سلسلہ لوک گیت یا عوامی شاعری سے ملا دیے، اس میں نادر اور اچھوتے خیالات دور از کار تشبیہات اور بعید از فہم استعارات کی قطعاً گنجایش نہیں ھوتی، اور اسے شاعری

کے کسی مروجہ یا مسلمہ معیار پر نہیں پرکھا جا سکتا ایسے کلام لکھنے والے شاعر کو عوام کے ساتھ رھنا بلکہ ان کے دلوں میں اترنا پڑتا ھے اسی لئے اس میں تاثیر بھی زیادہ ھوتی ھے ۔

معلوم ایسا ھوتا ھے کہ میلوں ٹھیلوں کے علاوہ نظیر نے درویشوں اور فقیروں کی بھی صحبت اٹھائی تھی جس کی وجہ سے آن کی طرح سوچنے کا انداز، انکا بیان اور ان کے خاص استعارات اور تشبیہات سے براہ راست واقفیت ھو گئی تھی، اس کی مثال اور نظموں کے علاوہ، جھونپڑا، کے عنوان سے ایک نظم میں ملتی ھے ۔

یہ تن جو ھے ھر اک کے اتارے کا جھونپڑا
اس میں ھے اب بھی سب کے سہارے کا جھونپڑا
اس سے ھے بادشاہ کے نظارے کا جھونپڑا
اس میں ھی ھے فقیر بچارے کا جھونپڑا
اپنا نہ مول کا نہ اجارے کا جھونپڑا
بابا یہ تن ھے دم کے گذارے کا جھونپڑا

آگے چل کر نظم میں حسب معمول تفصیل اور جزئیات نگاری ھے ۔ اسی جھونپڑے میں بھوے بھالے اور اسی میں سیانے رھتے ھیں، اسی میں ھوشیار اور دیوانے، اسی میں اپنے اور بیگانے، اسی میں عشق و محبت کے ماروں کی گزر اور اسی میں شوخ چاند ستاروں کا مقام ھے ۔ اسی میں دوست، اور پیارے، اھل دولت، منعم اور امیر اور اسی میں سارے جہاں کے فقیر بستے ھیں اور اسی میں شاہ اور وزیر، صغیر اور کبیر سب سماتے ھیں، اسی میں چور اور ٹھگ آباد ھیں اور اسی میں کوتوال، رونی شکل والے اور ٹھٹول، باجے نقارے اور ڈھول سب اسی میں بجتے ھین پارسا اور رند، بیدرد اور دردمند، شاہ، وزیر، وکیل، بخشی متصدی اور امیر سب اسی جھونپڑے کے مکیں ھیں ۔

دیکھنے میں نظم میں کوئی غیر معمولی بات نہیں لیکن انسانی مساوات کا یہ بنیادی پہلو جس طرح نظیر نے دیکھا ھے اردو شاعری میں کسی کو ان سے پہلے نظر نہیں آیا تھا

اس سلسلے کی ایک اور نظم ہے

جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

اسکا لب و لہجہ اور انداز بیان فقیرانہ یا سادھوانہ نہیں متصوفانہ یا عارفانہ ہے۔

دنیا میں کوئی شاد کوئی درد ناک ہے
یا باخوشی ہے یا الم کے سبب سینہ چاک ہے
ہر ایک دم سے جان کا ہر دم شیاک ہے
ناپاک تن پلید نجس یا کہ پاک ہے
جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

اس میں پھر جزئیات اور تفصیلات ہیں، اولیا انبیا بھی خاک ہوئے اور وہ بھی جو سات ولایت کے بادشاہ تھے اور جن کی بارگاہ حشمت میں عرش سے اونچی تھی، وہ کج کلاہ محبوب جن کے تن مثل پھول کے اور جن کے چہرے رشک ماہ تھے وہ بھی اوّل اسی خاک سے بنے تھے اور آخر اسی خاک میں مل گئے، وہ گورے گورے تن کہ جو ہاتھ لگانے سے میلے ہوں وہ بھی انجام کار خاک میں رل گئے،

عمدوں کے تن کو تانبے کے صندوق میں دھرا
مفلس کا تن پڑا رہا ماٹی اوپر پڑا
قایم یہاں یہ اور نہ ثابت وہ واں رہا
دونوں کو خاک کھا گئی یارو کہوں میں کیا
جو خاک سے بنا وہ آخر کو خاک ہے

گو ایک کو ہزار روپے کا ملا کفن
اور ایک یوں پڑا رہا بیکس برہنہ تن
کیڑے مکوڑے کھا گئے دونوں کے تن بدن
دیکھا جو ہم نے آہ تو سچ ہے یہی سخن
جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

اگرچہ ہر بند کے آخری مصرعے کی تکرار بظاہر صرف دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کے نقش کو قائم کرتی ہے لیکن یہ دونوں بند پھر ایک مرتبہ انسان کی مساوات اس کے انجام سے ثابت کرتے ہیں،

وہ امتیازات جو اتفاق سے پیدا ہوتے ہیں اور انسان کو امیر و غریب میں تقسیم کرتے ہیں اس منزل پر پہنچکر ختم ہو جاتے ہیں، موت کا ہاتھ ان سطحی بلندیوں اور پستیوں کو ایک جنبش میں ہموار کر دیتا ہے - اخلاقی مضامین کے بیان میں بھی نظیر نے ایک نیا انداز اختیار کیا ہے اور جہاں تک ممکن ہوا ہے عام کہی ہوئی باتوں اور مثالوں سے احتراز کیا ہے - مثلاً اُن کی ایک نظم بڑھاپے پر ہے - ضعیفی اور پیری پر غزلوں کے متفرق اشعار، مثنویوں کے بعض ٹکڑے، بعض قصیدے اور متفرق نظمیں تلاش کرنے سے مل جائینگی لیکن ان میں مضامین وہی عام ہیں کہ پیری میں ولولے ٹھنڈے پڑجاتے ہیں دل میں اُمنگ باقی نہیں رہتی، دانت ٹوٹ جاتے ہیں - کھانے پینے کا مزہ جاتا رہتا ہے سر ہلنے لگتا ہے - اعضائے رئیسہ بھی ایک ایک کرکے جواب دے جاتے ہیں، ان ہی مضامین سے طرح طرح کے اخلاقی نتائج بھی نکالے جاتے ہیں - مثلاً حیات انسانی ناپائیدار اور یہ دنیا بے ثبات ہے - موت سے کسی کو مفر نہیں، دنیا کے مراتب قابل اعتبار نہیں ہیں - انسان کو سفر آخرت کی تیاری کرنا چاہئے، دنیا دھوکے کی ٹٹی ہے، یہاں کوئی کسی کا ساتھی نہیں نہ کسی سے کچھ حاصل ہے - تو دل اور ترک و تجرید اختیار کرو، جو مانگو سو خدا ہی سے مانگو موت کے آگے علم و فضل سب ہیچ ہے یہ اور اس قسم کے تمام مضامین ایک خاص ذہنی افتاد کی طرف اشارہ کرتے ہیں - جسے ہم عام طور پر تصوف کے نام سے تعبیر کرتے ہیں لیکن تصوف اس رجحان کا صرف ایک مظہر ہے یہ بالعموم یہ جذبات تمام گرم ملکوں میں خاص طرر پر نمایاں ہوتے ہیں جہاں انسان ماحول میں خود کو بہت پست و کمزور محسوس کرتا ہے، موت کا خوف ہر لمحہ اس پر غالب رہتا ہے اور ذہنی اعتبار سے انسان کی وہ حالت ہوتی ہے جو میدان جنگ میں ایک شکست خوردہ سپاہی کی، ہو سکتی ہے - اس ذہنیت کا شدید ترین اظہار خاص حالات اور خاص ذہنی ساخت کے افراد میں خاص طور پر نمایاں ہوا کرتا ہے - نظیر کا زمانہ اور نظیر کی شخصیت ایسی ہی ہے، اس زمانہ کے تمام شعرا جنکا زمانہ نادر کے حملے سے پہلے یا اس کے بعد کا ہے اسی کے ترجمان ہیں، ممکن ہے یہ حالات اگر کسی ایسے ملک میں رونما ہوئے ہوتے جو آب و ہوا کے اعتبار سے ہندوستان سے مختلف

ہوتا تو یہ عین ممکن تھا کہ لوگوں میں ان حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے جرأت پیدا ہوتی اور اس صحت مند جذبے کا اظہار شعر و ادب میں بھی پایا جاتا لیکن آریوں کی آمد سے لے کر عصر حاضر کی تاریخ تک ایک موقع بھی ہندوستان کی تاریخ میں ایسا نہیں ملتا جہاں اس ملک کے رہنے والوں نے حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہو اور انہیں مار بھگایا ہو، بلکہ ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ معمولی سا مقابلہ کرکے پسپائی قبول کر لی اور فتحمندوں کے سامنے سر جھکا دیا - آریوں کی آمد کے بعد کول دراوڑ اور دوسری نسل کے لوگوں پر جو گزرا وہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، پھر وہ منگول حملہ آور ہیں جو مسلمانوں سے پہلے یہاں حملے کرتے رہے، یونانیوں کا حملہ اثر کے اعتبار سے خاص اہم ہے لیکن یہاں بھی مدافعت ناکام نظر آتی ہے، پھر مسلمانوں کی فتحمند افواج کے سامنے یہاں کے باشندے خس و خاشاک کی طرح بہتے چلے گئے، یہ نیا حملہ بعض اعتبارات سے بہت سخت تھا، اس سے صرف حکومت ہی نہیں مذہب بھی خطرہ میں تھا لیکن یہ خطرہ بھی ہندوستان کے باشندوں کو ایک محاذ بنانے اور حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لئے متحد نہ کرسکا، مسلمانوں کے زمانے میں جو حملے افغانستان کے راستے سے ہوئے ان کا بھی یہی انجام ہوا اور بالکل آخر میں جب ایک نئی قوم نے اسے اپنی طاقت آزمائی کے لئے منتخب کیا تو پھر ایک دفعہ مدافعت اور ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی بجائے ایک ایک کر کے ملکی نواب اور امراء اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے چلے گئے یہاں تک کہ ایک دن دلی کے تخت تیموری کا مالک جس کو ظل اللہ اور ظل السبحانی کہنے والے دلی میں ہی موجود تھے ان کی آنکھوں کے سامنے دست بستہ اور اور پابجولاں دلی کی شاہراہوں سے گزرتا ایک دور دراز ملک میں اپنے آخری ایام بسر کرنے کے لئے چلا گیا اور اس مشت خاک کی طرح جو کسی کے کام نہ آ سکے ایک دن پیوند خاک ہو گیا، اس اعتبار سے نادر شاہ کا حملہ اور اس کے ما بعد اثرات اس ملک کی تاریخ میں کوئی غیر معمولی واقعہ ثابت نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ ذہنیت جس کی ترجمانی نظیر اور ان کے معاصرین کرتے ہیں ایک منفرد مظہر ہے یہ بات البتہ درست ہے کہ ایسے حالات پیش آنے کے بعد جو رد عمل ہوتا ہے وہ نسبتاً شدید ہوتا ہے اور جو فنکار ان حالات سے گزرتے ہیں وہ اس کا

زیادہ اثر قبول کرتے ہیں، نظیر کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔

کلام کے اس حصے میں جسے اخلاقی کہ لیجئے یا کسی اور نام سے منسوب کیجئے ایک نظم 'موت' کا عنوان ہے - مفہوم اسکا یہی ہے کہ موت سے کسی کو مفر نہیں لیکن جن حالات نے نظیر کو اسکا یقین دلایا ہے وہ یہ نہیں -

دن رات رن مچی ہے یہاں اور پڑی ہے جنگ
چلتی ہے نت اجل کی سناں، گولی اور تفنگ
جس کا قدم بڑھا، وہ موا وو ہیں بے درنگ
جو جی چھپائے بھاگا تو اسکا ہوا یہ رنگ
وہ بھاگتے میں تیغ و تبر کھا کے مر گیا،
جیتا رہا نہ کوئی، ہر اک آ کے مر گیا،

موت کے اس یقین میں خوش باش اور دل تنگ، عاقل اور بے عقل سب ہی شریک ہیں

دنیا میں اپنا جی کوئی بہلا کے مر گیا
دل تنگیوں سے اور کوئی اکتا کے مر گیا
عاقل تھا وہ تو آپ کو سمجھا کے مر گیا
بے عقل چھاتی پیٹ کے گھبرا کے مر گیا
دکھ پا کے مر گیا کوئی سکھ پا کے مر گیا
جیتا رہا نہ کوئی، ہر اک آ کے مر گیا

غرض گویا و خاموش، عشرت دوست اور عیاش، نمازی و شرابی، کامل فقیر، مہوس و مفلس، خوش لباس اور چتھڑوں کو محتاج، سالک و صوفی ذی عزت و بے وقعت، شاہ و گدا، عاشق و معشوق، عاقل، حکیم عامل، فاضل، رمال اور پنڈت، نجومی بید، اشراف اور اونچی ذات والے غرض زندگی کے ہر میدان اور ہر رنگ میں جہاں دیکھئے اس سے مفر نہیں - نظیر نے اس نظم میں جس میں سترہ بند ہیں ان میں سے ایک ایک کی موت کا حال الگ الگ لکھ کر ایسا سماں باندھا ہے کہ پڑھنے والے کو یقین ہو جاتا ہے کہ واقعی موت سے مفر نہیں اس قسم

کی ایک اور نظم ہے جسکا موضوع یہ ہے کہ دنیا کے مراتب قابل اعتبار نہیں - یہ نظم اس حیثیت سے اہم ہے کہ اس میں نظیر نے آن بیشمار سپہ سالاروں، امیرں اور وزیروں کا نام بنام ذکر کیا ہے جنکا دیکھتے دیکھتے نام و نشان مٹ گیا، اس کے بعض بند ملاحظہ ہوں

کتنے دنوں یہ غل تھا، نواب ہیں یہ خاں ہیں
یہ ابن پنج ہزاری، یہ عالی خانداں ہیں
جاگیر و مال و منصب سب آج اُن کے ہاں ہیں
دیکھا تو اک گھڑی میں نہ نام نہ نشاں ہیں
دو دن کا شور و چرچا گھر گھر ہوا تو پھر کیا

کہتا تھا کوئی دیکھو یہ ہیں امیر خاں[1] جی
اور یہ ہیں خاں خانان اور یہ مشیر خاں جی
پنجا[2] اُٹھا قضا کا جب آئے شیر خاں جی
پھر کس کے میر خاں جی کس کے وزیر خاں جی
عمدہ غنی توانگر بازر ہوا تو پھر کیا

کہتا تھا کوئی گھوڑا ہے نامدار خاں کا
یہ پالکی یہ ہاتھی ہے ذوالفقار[3] خاں کا
آیا قدم اجل کے جب تیس مار خاں کا
خر بھی کہیں نہ دیکھا پھر شہسوار خاں کا
جھپان، میگ ڈنبر در پر ہوا تو پھر کیا

کہتا تھا کوئی ڈیوڑھی یہ ہے خان[4] مہرباں کی
یہ باغ یہ حویلی ہے محلدار[5] خاں کی
جب راج نے قضا کی کرنی بسولی ٹاکی
اک اینٹ بھی نہ پائی ہرگز کسی مکاں کی
رنگیں محل سنہرا گھر در ہوا تو پھر کیا

---

۱ - امیر خاں، محمد شاہ رنگیلے کا مصاحب -
۲ - غالباً سکھوں کی یورشوں کی طرف اشارہ ہے -
۳ - ذوالفقار خاں سپہ سالار اورنگ زیب رحہ -
۴ - غالبہ نواب مہربان خاں رند کی طرف اشارہ ہے -
۵ - محلدار خاں کا باغ دلی میں شہر کے باہر غالب کے زمانہ تک موجود تھا (فارسی رقعات) -

کہتا تھا کوئی یہ لشکر ہے طرہ باز خاں کا
یہ خیمہ شامیانہ ہے شہنواز[1] خاں کا
آیا کپک اجل کے جب یکہ تاز خاں کا
سر بھی کہیں نہ پایا پھر سرفراز[2] خاں کا
سردار، میر بخشی، بڑھ کر ہوا تو پھر کیا

پوری نظم میں بتیس بند ہیں جن میں نظیر نے اپنے عام انداز کے مطابق مختلف سوسائٹی کے مختلف طبقوں، ارباب علم و فن وغیرہ کا الگ الگ ذکر کیا ہے اور سب کا انجام آخر فنا بتایا ہے۔

اس انداز کی ایک اور تیرہ بند کی مختصر سی نظم بھی ہے جسکا پہلا بند یہ ہے:—

گر با وفا ہو کر عمل ملکوں ہوا تو کیا ہوا
دو دن کا نرسنگا بجا بھوں بھوں ہوا تو کیا ہوا
غل شور ملک و مال کا کوسوں ہوا تو کیا ہوا
یا ہو فقیر آزاد کے رنگوں ہوا تو کیا ہوا
گر یوں ہوا تو کیا ہوا اورووں ہوا تو کیا ہوا،

بظاہر یہ معمولی نظم ہے اور جن خیالات کا ان میں اظہار کیا گیا ہے وہ بھی نئے نہیں ہیں لیکن جس زمانہ میں نظیر نے یہ نظم لکھی اس عہد کی ذہنیت کی ترجمانی اس ٹیپ کے مصرعے سے بڑھ کر اور کسی طرح نہیں ہو سکتی طبیعت کا یہ انداز کہ چاہے کچھ ہو ہونے دو ایسی ذہنی کیفیت کا ترجمان ہے جہاں قوت ارادہ و عمل مفلوج ہو کر رہ گئی ہو، ممکن ہے بعض لوگ اس تلخ کیفیت کو استغنا کا خوشگوار نام دے کر مطمئن ہو جائیں لیکن یہ استغنا در اصل قوت ارادہ اور جوش کردار کے قطعی فقدان کا ایک مظاہرہ ہے

---

۱ - شہنواز خاں ناصر جنگ، مدار المہام ریاست حیدر آباد۔

۲ - سرفراز خاں شجاع الدین کا بیٹا اور مرشد قلی خاں کا پوتا، ۱۷۴۰ میں مسندنشین ہوا، نادر شاہ کا حملہ اسی کے زمانہ میں ہوا نادر گردی کے بعد علی وردی خاں بنگالہ کی صوبہ داری کی سند لے کر مرشد آباد پہنچا، سرفراز خاں گولی سے مارا گیا،

ان خارجی حالات اور ذھنی کیفیات میں لازمی نتیجه یه نکلتا ھے که انسان بجائے دنیا میں کچھ کرنے کے توشه آخرت جمع کرنے اور اس سفر پر روانه ھونے کی تیاری میں لگ جاتا ھے جس سے اج تک کوئی مسافر لوٹ کر نہیں آیا، فقیروں کی صدائیں ھوں یا صوفیوں کے ارشادات سب میں ترک دنیا کا انجام یہی نکلتا ھے - نظیر کی اس قسم کی کئی نظمیں ھیں ان میں بنجارہ نامه کی طرز کی ایک نظم ھے جسے فقیر کبڑی نامه کہتے ھیں اور اپنی صداؤں میں گاتے پھرتے ھیں - اسکا پہلا بند یه ھے :—

بٹ مار اجل کا آ پہنچا ٹک اس کو دیکھ ڈرو بابا
اب اشک بہاؤ آنکھوں سے اور آھیں سرد بھرو بابا
دل ھاتھ اٹھا اس جینے سے بے بس من مار مرو بابا
جب باپ کی خاطر روتے تھے اب اپنی خاطر رو بابا
تن سوکھا، کبڑی پیٹھ ھوئی، گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا، چلنے کی فکر کرو بابا

———

نظم کا آھنگ اس کی بے اور الفاظ کا انتخاب و نیز ان کی ترتیب ایسی ھے که مل کر مضمون کی اثر آفرینی میں اضافه کرتے ھیں، خاص سیاسی اور ملکی حالات کی جھلک دیکھنا ھو تو یه بند پڑھئے :—

یه اسپ بہت کودا اچھلا، اب کوڑا مارو زیر کرو
جب مال اکھٹا کرتے تھے، اب تن کا اپنے ڈھیر کرو
گڑھ ٹوٹا، لشکر بھاگ چکا، اب میان میں تم شمشیر کرو
تم صاف لڑائی ھار چکے، اب بھاگنے میں مت دیر کرو
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ھوئی، گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارا باج چکا، چلنے کی فکر کرو بابا

———

اس بند کے پڑھنے کےبعد ھمارے سامنے اس عہد کے وہ سرداران لشکر اور امرائے دولت آ جاتے ھیں جو اپنی ھزیمت کو آخری اور قطعی سمجھ چکے تھے اور جنکا خیال تھا که جب قلعه ٹوٹ چکا ھو، اور لشکری بھاگ گئے ھوں اس وقت انہیں بھی شمشیر میان میں کر لینا

چاهئے، اور اعتراف شکست کر لینا چاهئے اس وقت بقول شاعر ان کے سامنے صرف ایک راسته هے اور وه "فرار" کا هے، چنانچه وه یهی مشوره دیتا هے

تم صاف لڑائی هار چکے اب بهاگنے میں مت دیر کرو

یهاں یه بهاگنا یا فرار، اپنی اِنتهائی شکل میں یعنی "زندگی سے فرار" کی شکل میں ظاهر هوتا هے اور یه بهی اُسی رجحان کا ایک جزو هے جس کی تفصیل اوپر بیان کی جا چکی هے اس صورت حال کو پیش نظر رکھیں تو اورنگ زیب کی وفات سے نادر شاه کے حملے تک اور پهر اس کے بعد اهل هند بالخصوص دلی والوں کی پے در پے اور مسلسل شکستوں کا راز آسانی سے سمجھ میں آ جاتا هے - اور معلوم هوتا هے که تنزل کا ایک تیز رفتار دور شروع هو چکا هے اس دور میں ایک شخص بهی ایسا نظر نهیں آتا جو میدان جنگ میں شکست کو فتح کا پیش خیمه بنانے کی صلاحیت رکھتا هو اور هر هزیمت جس کے عزم و استقلال اور جوش عمل کے لئے ایک نئے تازیانے کا کام دے سکے

اس نظم کی روح یهی هے جو آپ نے دیکھی کچھ بند اور دیکھئے :—

سر کانپا ، چاندی بال هوئے، منه پهیلا پلکیں آن جهکیں
قد ٹیڑھا، کان هوئے بهرے، اور آنکھیں بهی چندهیائے گئیں
سکھ نیند گئی اور بهوکھ گهٹی، دل سست هوا، آواز نهیں
جو هونی تهی سو هو گزری اب چلنے میں کچھ دیر نهیں
تن سوکها کبڑی پیٹھ هوئی ، گهوڑے پر زین دهرو بابا
اب موت نقارا باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

کچھ دیر نهیں اب چلنے میں، کیا آج چلو یا کل نکلو
کچھ کپڑا البته لینا هو سو جلدی باندھ سنبهل نکلو
اب شام نهیں، اب صبح هوئی جوں موم پگهل کر ڈهل نکلو
کیوں ناحق دهوپ چڑھاتے هو؟ بس ٹهنڈے ٹهنڈے چل نکلو
تن سوکها کبڑی پیٹھ هوئی گهوڑے پر زین دهرو بابا
اب موت نقارا باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ آخری بند فرار کی خواہش کی انتہائی شدت ظاہر کرتا ھے
اب تک نظیر کی جن نظموں کا ذکر ہو رہا تھا انہیں رجحانات
کے اعتبار سے صوفیانہ کہہ سکتے ھیں لیکن بعض نظمیں ایسی ھیں
جن میں نہایت واضح طور پر مسلمان صوفیا کی تعلیمات نظم کی گئی ھیں
ان میں ایک عشق حقیقی ھے جو دراصل شریعت اور طریقت کا
بنیادی امتیاز ھے - صوفیوں کے نزدیک معرفت حاصل کرنے کا سیدھا
صاف اور یقینی راستہ صرف عشق حقیقی ھے - عشق مجازی اسکا صرف
پہلا زینہ اور پہلا قدم ھے اور جہاں عاشق محبوب کی ذات میں
فنا ہو جائے وھیں تکمیل ذات حاصل ہوتی ھے - جو اس راستے پر
گام زن ہوتا ھے وہ دوسرے راستوں کی راہ و رسم بھول جاتا ھے -
سوائے غم محبوب کے دنیا کا اور کوئی غم اسے نہیں ستاتا وہ
خود کو بھول جاتا ھے اور جس قدر اس راستے میں اسکا قدم آگے
بڑھتا ھے اسی قدر وہ تعینات کی قید سے آزاد ہوتا جاتا ھے -

یہ کہنا تو مشکل معلوم ہوتا ھے کہ نظیر اصطلاحی معنوں
میں صوفی تھے اور واقعی ترک دنیا پر انہوں نے عمل کیا تھا'
صوفیوں کی زندگی کے بر عکس نظیر کا عشق خالص قسم کا مجازی
بلکہ جنسی معلوم ہوتا ھے، دنیا سے بھاگنے کی جگہ عملاً وہ میلوں
ٹھیلوں اور جلسوں جلوسوں میں شرکت کرتے تھے، عیش دنیا
انہیں حاصل نہ تھا لیکن اس کے حصول کی طلب ان میں جگہ جگہ
ملتی ھے بلکہ ایک قسم کی ناآسودگی جو ان کے کلام میں جا بجا
ملتی ھے اسکا سبب بھی انکی یہی افتاد طبع ھے کہ وہ دنیاوی لذتوں
کو حاصل کرنا چاھتے تھے لیکن نہ کرسکتے تھے، غالباً عشق
حقیقی کا یہ انداز صرف اس ناآسودگی اور محرومی کا ھی نتیجہ ھے :-

ھیں عاشق اور معشوق جہاں وھاں شاہ وزیری ھے بابا
نہ رونا ھے نہ دھونا ھے نہ درد اسیری ھے بابا
دن رات بہاریں چہلیں ھیں اور عشق صفیری ھے بابا
جو عاشق ہوئے سو جانے ھیں یہ بھید فقیری ھے بابا
ہر آن ہنسی ہر آن خوشی ہر وقت امیری ھے بابا
جب عاشق مست فقیر ہوئے پھر کیا دل گیری ھے بابا

———

ہے چاہ فقط اک دل برکی پھر اور کسی کی چاہ نہیں
اک راہ اسی سے رکھتے ہیں پھر اور کسی سے راہ نہیں
یہاں جتنا رنج اور تردد ہے ہم ایک سے بھی آگاہ نہیں
کچھ مرنے کا سندیہہ نہیں کچھ جینے کی پرواہ نہیں
ہر آن ہنسی ہر وقت خوشی ہر وقت امیری ہے بابا
جب عاشق مست فقیر ہوئے پھر کیا دل گیری ہے بابا

کچھ ظلم نہیں کچھ زور نہیں، کچھ داد نہیں فریاد نہیں
کچھ قید نہیں کچھ بند نہیں، کچھ جبر نہیں آزاد نہیں
شاگرد نہیں استاد نہیں ویران نہیں آباد نہیں
ہیں جتنی باتیں دنیا کی سب بھول گئے کچھ یاد نہیں
ہر آن ہنسی ہرآن خوشی . . . .
. . . .

ہم چاکر جس کے حسن کے ہیں وہ دلبر سب سے اعلا ہے
اس نے ہی ہم کو جی بخشا اس نے ہی ہم کو پالا ہے
دل اپنا بھولا بھالا ہے اور عشق بڑا متوالا ہے
کیا کہئے اور نظیر آگے؟ اب کون سمجھنے والا ہے
ہر آن خوشی . . . .
. . . .

اس بند میں ایک جگہ نظیر کے دل کا چور ظاہر ہو ہی گیا، دل ان کا بھولا بھالا ہے اور عشق بڑا متوالا—اس رنگ نے کیا کیا نقشے دکھائے ہونگے اُن کی جھلک ہمیں نظیر کے کلام میں جا بجا ملتی ہے - آگے کیا کہیں کون سمجھنے والا ہے -

تصوف کے جن مسائل کو صوفی شعرا نے خاص طور پر اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ خدا کی خدائی دنیا میں ہر چیز میں ظاہر ہے - اسی لئے چشم بینا اندھیرے، اجالے، دشت و دمن، صحرا و ریگستان، ہر جگہ، ہر وقت، ہر سمت و جہت اور ہر رنگ میں اسے دیکھ سکتی ہے بقول نظیر—ہ

ہر آن میں ہر ڈھنگ میں ہر بات میں پہچان
عاشق ہے تو دل بر کو ہر اک رنگ میں پہچان

نظیر نے اپنی اس نظم میں بھی عادت کے مطابق جزئیات نگاری اور تحلیل و تجزیہ سے کام لیا ہے، نظم کے ۹ بندوں میں سے دو کا نمونہ دیکھئے:—

پھل پات کہیں شاخ کہیں پھول کہیں بیل
نرگس کہیں سوسن کہیں بیلا کہیں را بیل
آزاد کوئی سب سے کسی کا ہے کہیں میل
ملتا ہے کوئی راکھ چنبیلی کا کوئی تیل
کرتا ہے کوئی ظلم کو، لیتا ہے کوئی جھیل
باندھے کہیں تلوار اٹھاتا ہے کہیں سیل
ادنیٰ کوئی اعلیٰ کوئی سوکھا کوئی ڈنٹر پیل
جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں یہ سب کھیل
ہر آن میں . . . .

جاتا ہے حرم میں کوئی قران بغل مار
کہتا ہے کوئی دیر میں پوتھی کے سماچار
پہنچا ہے کوئی پار بھٹکتا ہے کوئی وار
بیٹھا ہے کوئی عیش میں پھرتا ہے کوئی زار
عاجز کوئی بیکس کوئی ظالم کوئی لٹھ مار
مفلس کوئی ناچار تونگر کوئی زردار
زخمی کوئی ماندا کوئی اچھا کوئی بدکار
جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں سب اسرار
ہر آن میں . . . .

ایک اور نظم کا عنوان تسلیم و رضا یا خوش حال نامہ ہے، اس نظم کی بنیادی ے یہ ہے کہ ہر حال میں خوش رہنا کمال فقر ہے -

ایسے سیاسی اور سماجی ماحول میں جو نظیر کو نصیب ہوا تھا، جس میں گردش دھر نے امیر و غریب، مفلس و تونگر ھندو و

مسلمان، کمزور اور طاقتور سب کو برابر کر رکھا تھا ایسے خیالات کا رواج پا جانا بالکل قرین قیاس ہے اور پھر نظیر طبعاً انسان دوست تھے اور ان اختلافات کو جو اُن کے نزدیک بنیادی نہیں محض فروعی تھے زندگی کی بنیادی اقدار میں شمار نہیں کرتے تھے، ہمہ اوست یا ہمہ ازوست کا یہ عام رنگ یہاں نظیر کی شخصیت کا مخصوص ٹھپہ لئے نظر آتا ہے ۔

جو فقر میں پورے ہیں وہ ہر حال میں خوش ہیں
ہر کام میں ہر دام میں ہر جال میں خوش ہیں
گر مال دیا یار نے تو مال میں خوش ہیں
بے زر جو کیا تو اسی احوال میں خوش ہیں
افلاس میں ادبار میں اقبال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد، جو ہر حال میں خوش ہیں

نظیر کی مست قلندری ملاحظہ ہو:—

گر اس نے اڑھایا تو لیا اوڑھ دوشالا
کمل جو دیا تو وہی کاندھے پہ سنبھالا
چادر جو اڑھائی تو وہی ہوگئی بالا
بندھوائی لنگوٹی تو وہی ہنس کے کہا ''لا''
پوشاک میں، دستار میں، رومال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

یہ قناعت، اور ''ترک جستجو'' در اصل اس عہد کی زندگی کے خاص حالات کا نتیجہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایسے مضامین کی انتہا اُن شعرا کے کلام میں جھلکتی ہے جو نادری حملے کے قریبی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں چنانچہ میر اور خواجہ میر درد کا کلام اسی روشنی میں دیکھنا چاہئے، ایک نظم وجد و حال کے متعلق ہے ۔

کیا علم انہوں نے سیکھ لئے، جو بن لکھے کو بانچے ہیں
اور بات نہیں منہہ سے نکلے، بن ہونٹھ ہلائے جانچے ہیں
دل اُن کے تار ستاروں کے، تن ان کے طبل طمانچے ہیں
منہ چنگ زبان دل سارنگی، پا گھنگھرو، ہاتھ کمانچے ہیں
ہیں راگ اُنہیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت بے سر تال ہوئے بن تال پکھاوج نانچے ہیں

کل باجے بج کر ٹوٹ گئے آواز لگی جب لہرانے
اور چھم چھم گھنگھرو بند ہوئے تب گت کا انت لگے پانے
سنگیت نہیں یہ سنگت ہے نٹوے بھی جس سے نٹ مانے
یہ ناچ کوئی کیا پہچانے، اس ناچ کو ناچے سو جانے
ہیں راگ . . . .

صوفیا فرماتے ہیں کہ دنیا میں ہر شے ہر وقت اللہ تعالی کی حمد و تسبیح میں مصروف رہتی ہے نظیر نے اس خیال کو ایک سادہ اور مختصر سی نظم میں ادا کیا ہے۔ خیالات کی سادگی، زبان کی روانی، ترنم اور آہنگ کے اعتبار سے یہ نظم اردو کے ادب العالیہ میں شمار ہونے کے لائق ہے :—

وقت سحر کی روحیں کیا کیا ہوں ہوں ہوں ہوں کرتی ہیں
ہوں ہوں ہوں ہوں کر کر ذکر کن اور فیکوں کرتی ہیں
مرغے بولے ککڑوں کڑوں، مرغیاں کوں کوں کرتی ہیں
طوطیاں بھی سب یاد میں اس کی بھتوں بھتوں کرتی ہیں
سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چونچوں کیا سب ملکر بیچوں بیچوں کرتی ہیں

اس کے بعد اپنے مخصوص انداز میں ہر چڑیا کی تفصیل علحدہ لکھی ہے مثلا :—

قمری بولے حق سرہ، بلبل بولے بسم اللہ
کبک ٹٹیری چاروں قل، اور تیتر بھی سبحان اللہ
دادر مور پپیہے کوئل کوک رہے اللہ اللہ
فاختہ کو کو تیہو ہو ہو، طوطے بولیں حق اللہ
سانجھ سویرے چڑیاں . . . .

ہنس، ہما، سرخاب، تدرویں بولیں یا رحمان میاں
سارو، ہریل اور لٹورے دھیڑ یا حنان میاں
ققنس، تیتر، چکوہ چکوی بولیں یا منان میاں
ہد ہد بولیں احد احد کچھ تو بھی کر رے دھیان میاں
سانجھ سویرے چڑیاں . . . .

انسان کی غفلت کا حال یہ ہے کہ

تن تن اور لم ڈھیک ، ممولا ، حق حق تار پروتے ہیں
اگھن ، بئے ، چنڈول ، ابلقے، یاد میں اس کی روتے ہیں
طائر تو سب تخم محبت اس کا دل میں بوتے ہیں
پنچھی اس کی یاد کریں ہم پانوں پسارے سوتے ہیں
سانجھ سویرے چڑیاں . . . . . .

چوں چوں چونچوں کیا سب ملکر بیچوں بیچوں کرتی ہیں

صوفیوں کے نزدیک زندگی کا اصلی مقصد محبوب حقیقی کی تلاش ہے چنانچہ تمام اشغال و اذکار کا مقصد یہی ہے کہ حجابات درمیان سے اٹھ جائیں اور محبوب کے جلوے سے ہمکنار ہو سکیں سعی انسانی اور جد و جہد کا مقصد بھی یہی ہے کہ تعینات کے پردے اٹھ جائیں اور اسے بیحجاب دیکھ سکیں، دنیا میں رہنا ہو یا ترک دنیا کریں اس مقصد کے علاوہ زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں نظیر نے ایک نظم میں جسکا عنوان تلاش محبوب حقیقی یا جوگی کا سچا روپ ہے اسی موضوع کو اختیار کیا ہے تلاش حق کا خیال آتے ہی انہوں نے تھوڑا سا گیرو منگایا اور کفنی رنگ ڈالی ۔ مندرے اور سلی گلے میں ڈالی ، منھ پر بھبوت ملا اور اودھوت جوگی بن گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور اس طرح کہ ماتھے پر سندور کا قشقہ کھینچا تھا ، جھولی گلے میں ، ہاتھ میں کھپر ، گیروا منڈاسا سر پر ، ترسول کاندھے پر، اس انداز سے صحراؤں اور بستیوں ، ویرانوں اور آبادیوں میں تلاش شروع کی، نہ سر کی خبر نہ پاؤں کا ہوش نہ بھوجن کا اندیشہ اور نہ کچھ امل پانی (بھنگ) کی فکر ، مسجد میں ، مدرسہ میں ، دیر میں تیرتھوں میں سب جگہ اسے تلاش کیا لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا پہاڑوں سے ٹکرایا ، شہروں میں گریہ و زاری کی ، لیکن مقصد حاصل نہ ہوا ، اس آزمائش سے گزرنے کے بعد یکایک اس محبوب نے اپنی جھلک دکھائی ۔ زمین و آسمان کے چودہ طبق روشن ہو گئے ۔ اور حقیقت حال منکشف ہو گئی ، ؎

ہوئی جب آ کے یکتائی دوئی کا اٹھ گیا پردا
جو کچھ وہم و دغا تھے اڑ گئے اک دم میں ہو پارا
نظیر اس دن سے ہم نے پھر جو دیکھا خوب ہر اک جا
وہی دیکھا وہی سمجھا، وہی جانا وہی پایا
برابر ہو گئے ہندو مسلمان 'گبر' نصرانی

یہ اور اس قسم کے اشعار جو دوسری نظموں میں پائے جاتے ہیں نظر کے ان رجحانات کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں - قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ نما سضامین محض رسمی ہیں یا ان میں کوئی حقیقت بھی پائی جاتی ہے - شاید بعض لوگوں کو شبہ ہو کہ جن روحانی تجربات کا ذکر صوفیوں کے یہاں ملتا ہے نظیر جیسے دنیادار کو ذاتی طور پر ان سے کیا سابقہ پڑ سکتا تھا اس لئے سمجھنا چاہیئے کہ یہ سارے مضامین محض رسمی اور تقلیدی ہیں لیکن نظیر کی فطرت، ان کی شاعری کے عام رجحانات اور میلانات دیکھنے کے بعد یہ تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے کہ ایسا شخص محض کسی روایت پرستی میں بھی مبتلا ہو سکتا ہے - در اصل یہ روایت پرستی نہیں ہے - تصوف سے لگاؤ بھی نظیر کی شخصیت کا ایک جزو ہے - صوفیوں کا مسلک ہے کہ ظاہر داری اور تصنع سے پرہیز کرتے ہیں ان کے نزدیک ریاکاری اور مکاری سے بڑھ کر کوئی عیب نہیں - ان کی شریعت میں اللہ کے بندوں سے محبت جزو ایمان بلکہ عین عبادت ہے - یہ امیروں کے سامنے سر نہیں جھکاتے، نہ درباروں میں سجدہ کرتے ہیں - ان کی خانقاہیں ہر شخص کے لئے کھلی ہوتی ہیں - وہاں دربان اور پہرہ‌دار نہیں بیٹھے ہوتے نہ آنے جانے والوں کے لئے روک ٹوک ہوتی ہے - صوفی خدا کے بندوں میں تمیز بندہ و آقا نہیں کرتے ان کی نظر میں میر و وزیر اور گدائے بینوا سب برابر ہوتے ہیں وہ کسی بلند مسند پر متمکن نہیں ہوتے بلکہ عوام کے دلوں تک پہنچنے کے لئے وہ عوام میں گھلے ملے رہتے ہیں - ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں - ناامیدی کے عالم میں انہیں سہارا دیتے ہیں - اور جب ہر طرف یاس کے بادل چھائے ہوتے ہیں یہ اپنی روحانی طاقت لئے امید کی کرن بن کر ظاہر ہوتے ہیں - صوفیوں کی یہ انسان پرستی اور آدم دوستی

نظیر کی طبعیت سے اسقدر قریب آجاتی ہے کہ اسکا قدرتی طور پر اس جماعت میں شریک ہوجانا ایک یقینی بات معلوم ہوتی ہے - اگر ایسا نہ ہوتا تو حیرت ہوتی - اور پھر نظیر کی آزاد مشربی اور قلندری بھی انہیں اسی طرف لے جا سکتی تھی، -

بعض صوفیا نے 'ترک دنیا' پر بڑا زور دیا ہے اور اس عقیدہ کے لئے مختلف توجیہات پیش کی ہیں انکا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا اور اس کے موانعات محض عارضی ہیں - یہاں کسی شے کو ثبات یاقرار نہیں انسان یہاں اکیلا اور خالی ہاتھ آتا ہے اور اکیلا اور خالی ہاتھ ہی رخصت ہوتا ہے اس لئے جاہ و منصب کی طلب، یا زرو جواہر کی تلاش بیسود ہے - یہاں کی الفت کا بھی یہی انجام ہے چنانچہ نظیر نے تمثیلی انداز میں اپنی مشہور نظم 'ہنس نامہ' میں یہی موضوع اختیار کیا ہے - کسی شہر سے ایک ہنس آیا اور جنگل کے ایک پیڑ پر بسیرا کیا، اس درخت پر اور بھی بہت سے طیور رہتے تھے اور وہ اس کی محبت کے دام میں گرفتار ہوگئے - اس موقع پر حسب معمول نظیر نے جزئیات نگاری سے کام لے کر مختلف پرندوں کے نام اور ان کی خصوصیات بھی نظم کی ہیں —

سب ہو کے خوش اس کی مے الفت لگے پینے
اور پیت سے ہر اک نے وہاں بھر لئے سینے
ہر آن جتانے لگے چاہت کے قرینے
اس ہنس کو جب ہو گئے دو چار مہینے
اک روز وہ یاروں کی طرف دیکھ پکارا

یہاں لطف و کرم تم نے کئے ہم پہ ہیں جو جو
تم سب کی یہ خوبی ہے کہاں ہم سے بیاں ہو
تقصیر کوئی ہم سے ہوئی ہووے تو بخشو
لو یارو اب ہم جاوینگے کل اپنے وطن کو
اب تم کو مبارک رہے یہ پیڑ تمہارا

اس طرح حرف و حکایت کے بعد وہ ہنس ایک دن منھ اندھیرے اس درخت پر سے رخصت ہوگیا، وہ اسیران محبت جو اس کی الفت میں بے طرح گرفتار تھے پیچھے پیچھے اڑ چلے لیکن آہستہ آہستہ ایک ایک

کی طاقت پرواز جواب دیتی گئی، کوئی کوس کوئی دو کوس کوئی زیادہ سے زیادہ نو دس کوس میں هارا

تھی اس کی محبت کی جو هر ایک نے پی مے
سمجھے تھے بہت دل میں وہ الفت کو بڑی شے
جب هوگئے بے بس پھر آخر یہ هوئی رے
چیلیں رهیں - کوے گرے اور باز بھی تھک گئے
اس پہلی هی منزل میں کیا سب نے کنارا

آخری بند میں تمثیل کا خلاصہ بیان کرتے هوئے لکھتے هیں :—

دنیا کی جو الفت ہے تو اس کی هے یہ کچھ راہ
جب شکل یہ هووے تو بھلا کیونکہ هو نرباہ
ناچاری هو جس جا میں تو واں کیجئے کیا چاہ
سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تو نظیر آہ
آخر کے تئیں هنس اکیلا هی سدهارا

اس تمثیلی انداز کی کئی اور نظمیں بھی نظیر کی کلیات میں شامل هیں - تمثیلی ادب کا یہ انداز تاریخی اعتبار سے نہایت قدیم هے اور اس کی مثالیں دنیا کے هر ادب میں خصوصاً زمانہ قدیم میں ملتی هیں - یونانیوں کی Aesops' Fable لقمان کی حکایات، اس انداز کا مقبول ترین نمونہ هیں - ان میں سے بعض حکایات ایسی هیں جن کے اصل ماخذات کا پتہ چلانا دشوار هے کیونکہ مشرق و مغرب کے بعید ترین گوشوں میں یہ یکساں طور پر رائج اور مقبول نظر آتی هیں - ایسی کہانیوں میں جانوروں میں انسانی اوصاف پیدا کرکے اخلاقی نتائج حاصل کئے جاتے هیں - نظیر کے یہاں اس قسم کی دو اور نظمیں پودنے اور گڑھ پنکھ کی لڑائی، اور ''کوے اور هرن کی دوستی'' هیں - پودنے کی کہانی کا خلاصہ یہ هے کہ ایک درخت پر ایک پودنے نے گھونسلا بنایا تھا جس میں پودنا، پودنی اور اس کے بچے رهتے تھے، اتفاق سے اسی جنگل میں ایک ارنی و ارنا بھی آ بسے، پودنی اور ارنی میں بہنا پا ٹھیرا محبت بڑھی - ایک دن وہ ارنی چرتی هوئی اس درخت کے نیچے آئی جس پر پودنے کا گھونسلا تھا اور اس پیڑ سے اپنی پیٹھ کھجانے لگی - درخت هلا

تو پودنی نے احتجاج کیا - ارنی بجائے شرمندہ ہونے کے اور ہنسی اور ارنے کو صورت حال سے آگاہ کیا ارنے کو ایک تفریح ہاتھ آئی اس نے ارنی کو دوبارہ یہی شرارت کرنے بھیجا - اب پودنا اور پودنی سمجھ گئے کہ اس شرارت کا مقصد صرف ان کو ستانا ہے چنانچہ دوسرے دن صبح جب ارنا پڑا سوتا تھا پودنا اس کے کان میں گھس گیا اور

ع پھر پھر کیا اور پردے میں پنچوں کو گڑایا

ارنا بیچارا سر ٹکرانے لگا، مجبور ہوکر ارنی نے پودنی کی خوشامد کی تو اس نے پودنے کو باہر آنے کے لئے آواز دی - اس مصیبت سے نجات پاتے ہی ارنا اس جنگل سے ایسا بھاگا کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہانی کا مقصد یہی ہے کہ دشمن ضعیف ہی کیوں نہ ہو اس سے ڈرنا ہی بھلا ہے - دوسری مشہور کہانی ہرن اور کوے کی دوستی کی ہے - ایک مکار گیدڑ ہرن کو دھوکہ دے کر لے جاتا ہے اور جال میں پھنسا دیتا ہے - کوا مدد کو پہنچتا ہے اور بتاتا ہے کہ صیاد کو دیکھ کر ہرن دم سادھ لے - صیاد مردہ سمجھ کر جال کے پھندے کھول دیتا ہے - اور ہرن بھاگ جاتا ہے - صیاد پیچھے سے ایک سونٹا پھینک کر مارتا ہے - ہرن تو بچ جاتا ہے لیکن گیدڑ کا سر پھٹ جاتا ہے - اور وہ اپنے کئے کی سزا پاتا ہے، کہانی سے جو اخلاقی نتیجہ نکالا گیا ہے وہ نظیر کی بعض اور نظموں میں بھی موجود ہے مثلاً یہ کہ زمانہ کلجگ نہیں کرجگ ہے یہاں اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے، جو جیسا کریگا ویسا پائے گا، اس قسم کی نظموں میں ایک وہ ہے جسکا ٹیپ کا شعر ہے

کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں - انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے، یاں سودا دست بدستی ہے

اس نظم میں ایک اور بند ذرا زیادہ واضح طور پر اس نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے :-

جو پار اتارے اوروں کو اس کی بھی ناؤ اترنی ہے
جو غرق کرے پھر اس کو بھی یاں ڈبکوں ڈبکوں کرنی ہے

شمشیر تبر، بندوق، سناں، اور نشتر تیر نہرنی ہے
یاں جیسی جیسی کرنی ہے پھر ویسی ویسی بھرنی ہے
کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں . . . . .

نظیر کی نظموں کا ایک خاصا حصہ مناظر فطرت پر مشتمل ہے، بعض لوگوں کو محض لاعلمی کی بنا پر یہ شکایت ہے کہ اردو شاعری میں مناظر فطرت پر بہت کم توجہ دی گئی ہے ۔ بعض اور لوگ کہتے ہیں کہ قصیدوں، مثنویوں یا مرثیوں میں منظر نگاری توکی گئی ہے لیکن اس کی حیثیت محض ضمنی ہے، در اصل یہ دونوں باتیں صحیح نہیں، ابتدائی دکھنی دور پر ہی نظر ڈالی جائے تو مختلف مناظر فطرت پر چھوٹی بڑی ہر طرح کی مسلسل نظمیں موجود ہیں ۔ ایک سلطان محمد قلی قطب شاہ کی مطبوعہ کلیات ہی اس دعوی کی تائید میں پیش کرنا کافی ہے ۔ سلطان نے ہندوستان کے مختلف موسموں، تہواروں، تقریبوں، باغوں، پھلوں پھولوں اور ترکاریوں پر اعلی درجے کی نظمیں لکھی ہیں ۔ لیکن اس عہد کی شاعری کا بڑا حصہ کچھ تو نایاب ہونے کی وجہ سے اور کچھ زبان کی اجنبیت اور قدامت کی وجہ سے عام ناظرین کی دسترس سے باہر ہے اور اسی وجہ سے یہ غلط فہمی عام ہوگئی ہے کہ اردو کی قدیم شاعری کا سرمایہ صرف غزل ہے ۔ حالانکہ ولی کی آمد کے بعد شمالی میں شاعری کا دور زریں میر و مرزا کا عہد ہے ان دونوں باکمالوں نے اپنی مثنویوں اور قصیدوں میں جسطرح منظر نگاری کی ہے اسے محض ذیلی یا ضمنی حیثیت نہیں دی جاسکتی، میر کی مثنویاں جن میں اپنے گھر کی ویرانی اور برسات کی خانہ خرابی کا نقشہ کھینچا ہے ہر حیثیت سے اعلے درجے کی مصوری کی تعریف میں داخل ہیں پھر میر حسن کی مثنویاں منجملہ اور خوبیوں کے اپنے مختلف مناظر کے اعتبار سے بھی اعلی درجے کی ہیں، اسی سلسلہ کی ایک کڑی نظیر بھی ہیں بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جس بلندی پر وہ پہنچ گئے ہیں وہ بحیثیت مجموعی ان سے پہلے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی تھی،

اعلی درجے کی مصوری اور منظر نگاری کے لئے بعض شرطیں ہیں

نظیر اکبرآبادی

ان میں پہلی شرط کائنات اور خاص طور پر اپنے ماحول کا تفصیلی جائزہ لینا ہے ۔ ایسے شعرا جن کی دنیا آن کے عشرت کدے اور آن کے ممدوح کے در دولت تک محدود ہو یا وہ شخص جو بقول آزاد کبھی مکان کی کھڑکی کھول کر یہ بھی نہ دیکھے کہ اس طرف ایک پائیں باغ بھی ہے اور جس کی گوشہ نشینی ترک دنیا تک پہنچ گئی ہو یا جو لوگوں سے ملنے جلنے اور بات چیت کرنے میں تامل کرے کہ کہیں عوام الناس سے گفتگو کرکے اس کی زبان خراب نہ ہو جائے، یا جسے اپنی برتری کا غرور ذرا نیچی سطح پر آکر دوسروں سے ملنے جلنے میں مانع ہو اس کی دنیا یقیناً نہایت محدود اور بڑی حد تک صرف خیالی ہوگی، نظیر کا معاملہ دوسرا تھا آن کی زندگی ہر قسم کے لوگوں سے ملنے جلنے میں بسر ہوتی تھی، سیر تماشہ کوئی میلہ ٹھیلہ جلسہ جلوس کوئی تہوار اور تقریب ایسی نہ تھی جس میں وہ نہ جا پہنچتے ہوں، اور پھر ان میں وہ صرف تماشائی کی حیثیت سے شریک نہیں ہوتے تھے بلکہ ایک لمحہ کے لئے وہ اپنے معلمی کے پیشے کو بھول جاتے تھے، بھنگ پینے والوں میں وہ بھنگ کے رسیا، فقیروں میں فقیر، آزادوں میں آزاد، اوباشوں میں اوباش اور تماش بینوں میں تماش بین بن جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ زندگی کی ہر سطح پر ان کا مطالعہ بالکل ذاتی، نہایت تفصیلی اور حقیقت پر مبنی ہے اور اسی لئے آن کے کلام میں بڑی وسعت اور پھیلاؤ ہے ۔ ایسی ہی وسعت اور پھیلاؤ جو زندگی میں موجود ہے بشرطیکہ اسے تصنع اور بناوٹ کی بندشوں میں نہ جکڑ دیا جائے، یہ صحیح ہے کہ ان کی بعض تصویریں اخلاق اور شرافت کے مروجہ معیار سے کچھ پست معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کے صحیح اور اصلی ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور ان میں بھی وہ خوبی موجود ہے جو حسن اور صداقت کے لازم و ملزوم ہونے سے پیدا ہوتی ہے ۔

کائنات اور ماحول کے تفصیلی مطالعہ کے بعد اعلی درجے کی منظر نگاری کے لئے دوسری شرط تحلیل و تجزیہ کی عادت ہے ۔ کائنات ایک وسیع عالم ہے اس کا بہت تھوڑا ہی حصہ انسان کے مشاہدے اور مطالعہ میں آتا ہے اور اس میں تمام چیزوں کو مساوی درجہ حاصل

نہیں ہوتا، بہترین فنکار کا اصلی کام اس وسیع کائنات کے مشاهدے سے انتخاب کرنا هے ۔ اور یه بات اسی وقت حاصل هوسکتی هے جب دیکھنے والا جزئیات پر نظر ڈالنے کا عادی هو، اعلی درجے کا مصور همیشه جزئیات کا خیال رکھتا هے اور انہیں کی ترتیب سے ایک مجموعی اثر پیدا کرتا هے ۔ ان جزئیات میں سے بعض کو وہ نمایاں طور پر ظاهر کرتا هے اور بعض عناصر کو زیادہ نمایاں کرنے کے لئے دوسرے عناصر کو نسبتاً هلکے رنگوں اور اشاروں سے ظاهر کرتا هے ۔ کبھی تضاد سے یه کیفیت پیدا کرتا هے غرض منظرنگاری اور مصوری دونوں میں تجزیه و تحلیل کرنے کی یه عادت نہایت ضروری هے ۔ نظیر کے کلام کی یه ایک نہایت ممتاز صفت هے که وہ پہلے ایک مجموعی حالت یا کیفیت بیان کرتے هیں پھر اس تصویر یا منظر کے مختلف اجزا کو الگ الگ کرکے آن کی خصوصیات کو نمایاں کرتے هیں جس کا نتیجه یه هوتا هے که وہ تصویر پوری طرح همارے سامنے آجاتی هے ۔ اس کی متعدد مثالیں اوپر نظر سے گزر چکی هیں ۔

کامیاب منظر نگاری کے لئے شاعر کے پاس وسیع ذخیرہ الفاظ کی سخت ضرورت هے ۔ فصاحت کا تقاضه یه هے که هر موقع کے لئے اسی کے مناسب الفاظ استعمال کئے جائیں، بعض الفاظ صوتی اعتبار سے نرم و نازک یا سبک اور شیرین هوتے هیں، بعض الفاظ میں ولوله، جوش و خروش اور طوفان هوتا هے ۔ بعض پر شوکت، متانت اور سنجیدگی کے حامل هوتے هیں، بعض مضحک بعض اندوهناک اور الم انگیز، الفاظ کا یه فرق صرف آن کی صوتی شکل و صورت تک محدود نہیں، معنوی باریکیاں بھی نہایت اهم هوتی هیں، بعض الفاظ بظاهر مترادف یا هم معنی نظر آتے هیں لیکن ماهرین لغت جانتے هیں که در اصل ایسے الفاظ کا وجود ممکن نہیں، هر لفظ ایک اور صرف ایک بنیادی تصور یا خیال کی ترجمانی کرتا هے ۔ البته جس طرح خیالات احساسات اور جذبات کا اتار چڑھاؤ نہایت نازک هوتا هے اور اکثر فرق نوعیت کا نہیں بلکه محض شدت کا هوتا هے اسی طرح ان خیالات، احساسات اور جذبات کو ظاهر کرنے والے الفاظ نوعیت کی بجائے محض شدت کے فرق کو ظاهر کرتے هیں ۔ مثلاً غم کا ایک عام جذبه

اپنے محرکات اور احساسات کے مدارج میں مختلف انتوع ہو سکتا ہے
اور اسی مناسبت سے یاس انگیز اور الم آفرین الفاظ کے بھی مدارج
ہو سکتے ہیں - اعلی درجے کی شاعری میں ہمیشہ الفاظ کی اس
اہمیت کا احساس ہوتا ہے - ہومر ، شیکسپیر ، رودکی، فردوسی،
کالیداس، میر تقی میر سب کا کلام اس کی تائید کرتا ہے لیکن اردو
شاعری میں الفاظ کے سرمایے کی وسعت اور انتخاب کے اعتبار سے
میر انیس اور نظیر اکبر آبادی کا درجہ نہایت بلند ہے - ان دونوں
میں ایک فرق بھی ہے - میر انیس کی شاعری کا موضوع صرف مرثیہ
ہے اور اگرچہ انہوں نے مرثیے کے حدود میں رہ کر جذبات نگاری
اور منظر نگاری کا بڑا کمال ، کیاہا ہے لیکن ان کی شاعری کا
کنوس (Canvas) پھر بھی محدود ہوکر رہ گیا ہے - انہوں نے
صرف چند طبقوں کے مردوں، عورتوں اور بچوں کے جذبات اور ان
پر گزرنے والے حالات و واقعات کو اپنا موضوع بنایا ہے - کربلا کا
واقعہ بھی ایک محدود جغرافیائی علاقے میں پیش آیا گیا ہے اس لئے
قدرتی طور پر مناظر میں وہ تنوع اور پھیلاؤ نہیں ہے جو نظیر کی
کلیات میں موجود ہے - اسی لئے بحیثیت مجموعی نظیر کے الفاظ کا ذخیرہ
انیس کے مقابلے میں زیادہ بھی ہے اور متنوع بھی لیکن اس سے یہ
نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ بحیثیت فنکار نظیر کا درجہ انیس سے بلند
ہے - اگر شاعری کو اچھی شاعری (Good Poetry) اور اعلی شاعری
(Great Poetry) میں تقسیم کیا جائے تو انیس کی شاعری میں زیادہ
عظمت کا اقرار کرنا پڑیگا -

اس وضاحت کے بعد نظیر کی ان نظموں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے
جن میں براہ راست منظر نگاری ملتی ہے سب سے پہلے ہماری نظر
اس مخمس پر پڑتی ہے جس کا ٹیپ کا مصرعہ ہے ؎

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اردو شعرا نے برسات پر بہت کچھ طبع آزمائی کی ہے لیکن
نظیر کی اس نظم میں دو باتیں خاص طور پر نمایاں ہیں - ایک تو یہ
کہ یہ منظر ایک تصویر کی بجائے متحرک معلوم ہوتا ہے، یہ
حرکت ایک طرح کا رقص مستی ہے جس میں نظیر اس دلفریب موسم

میں کائنات کو ناچتا دیکھتا ھے - خود ٹیپ کے مصرعے میں کیا کیا مچی ھیں یارو برسات کی بہاریں، اس حرکت کا پورا تصور موجود ھے دوسری بات یہ ھے کہ اس رقص کے ساتھ ایک ترنم اور موسیقی بھی ھے - اس کیفیت کو پیدا کرنے کے لئے نظیر نے ایسے الفاظ منتخب کئے ھیں جو اپنے صوتی تاثر سے یہ آھنگ پیدا کرتے ھیں، پہلے ھی بند سے یہ دونوں کیفیتیں سامنے آجاتی ھیں :—

ھیں اس ھوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاھٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھماوٹ قطرات کی بہاریں
ھر بات کے تماشے ھر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ھیں یارو برسات کی بہاریں

بارش ھونے سے پہلے بادل آسمان پر جمع ھوتے ھیں - پھر بوندا باندی شروع ھوتی ھے - اس کے بعد جھڑی لگتی ھے اور دیکھتے دیکھتے باغ و بوستان جل تھل ھوجاتے ھیں :—

بادل ھوا کے اوپر ھو مست چھا رھے ھیں
جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رھے ھیں
پڑتے ھیں پانی ھر جا جل تھل بنا رھے ھیں
گلزار بھیگتے ھیں، سبزے نہا رھے ھیں
کیا کیا . . .

الفاظ کے صوتی تاثر کی ایک اور مثال دیکھئے :—

مارے ھیں موج ڈابر، دریا ڈونڈ رھے ھیں
مور و پپیہے کویل کیا کیا امنڈ رھے ھیں
جھڑ کر رھی ھیں جھڑیاں نالے آمنڈ رھے ھیں
برسے ھے مینہ جھڑا جھڑ بادل گھمنڈ رھے ھیں
کیا کیا . . . . .

اس رقص و مستی میں وحوش و طیور بھی شریک ھیں - جب بجلی چمکتی ھے اور بادل گرجتے ھیں تو ایسا معلوم ھوتا ھے کہ

اللہ کی نوبت کے نقارے بج رہے ہیں - اور بادلوں کی گڑ گراھٹ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادل ٹکوریں لگا کر نوبت کی گت لگا رہے ہیں - جھینگر کی جھنکار میں سرنائیاں بج رہی ہیں - مور اور بگلے شور مچا رہے ہیں - پپیہوں نے پی پی کا راگ چھیڑ رکھا ہے اور مینڈک ملاریں گا رہے ہیں، تیتر سبحان تیری قدرت کا ورد کر رہا ہے، کوئل کی کوک اور مور کی زٹل میں بھی اسی کا پیغام ہے، بئے اور بٹیرے چہچہا رہے ہیں، قمری کو کو کرتی ہے تو بگلے تو تو پکارتے ہیں، ھدھدوں کی صدائے حق حق اور فاختہ کی ھو ھو گویا معرفت کے نغمے ہیں بقول نظیر

ع سب رٹ رہے ہیں تجھ کو کیا پنکھ کیا پکھیرو

برسات کا یہ پہلا منظر آنکھوں کے سامنے سے گزرنے کے بعد ایک اور مرقع سامنے آتا ہے عشق و عاشقی کی دنیا میں محروم بھی ہیں اور شاد کام بھی، وصل کی لذت سے سرشار بھی ہیں اور ہجر کے آلام میں گرفتار بھی، برسات ان کے لئے الگ الگ پیغام لاتی ہے

پھولوں کی سیج اوپر سوتے ہیں کتنے بن بن
سوہیں گلابی جوڑے پھولوں کے ہار ابرن
کتنوں کے گھر ہے کھانا، سونا لگے ہے آنگن
کونے میں پڑ رہی ہے سر منھ لپیٹ سوگن
کیا کیا مچی ہیں . . .

جو وصل میں ہیں ان کے جوڑے مہک رہے ہیں
جھولوں میں جھولتے ہیں گہنے جھمک رہے ہیں
جو دکھ میں ہیں سو ان کے سینے پھڑک رہے ہیں
آہیں نکل رہی ہیں آنسو ٹپک رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں . . . .

کتنوں نے اپنی غم سے اب ہے یہ گت بنائی
میلے کچیلے کپڑے آنکھیں بھی ڈبڈبائی
نے گھر میں جھولا ڈالا نے اوڑھنی رنگائی
پھوٹا پڑا ہے چولہا ٹوٹی پڑی کڑھائی
کیا کیا مچی ہیں

اور جن کو اب مہیا حسنوں کی ڈھیریاں ہیں
سرخ اور سنہرے کپڑے عشرت کی گھیریاں ہیں
محبوب دلبروں کی زلفیں بکھیریاں ہیں
جگنو چمک رہے ہیں راتیں اندھیریاں ہیں
کیا کیا مچی ہیں . . . .

یہ دوسرا منظر بھی نظروں سے گزرنے کے بعد اب ایک تیسرا مرقع سامنے آتا ہے ۔ کچھ لوگ محلوں میں بیٹھے عیش کا نظارا کر رہے ہیں ۔ کسی کا صرف ستھرا سائیبان اور بانس کا اسارا ہے ۔ جس کو کوٹھے میسر ہیں وہ وہاں سیر کر رہا ہے اور مفلس بیچارہ صرف پوے تلے گزارا کر رہا ہے ۔ کسی جگہ چھت گرنے کا شور ہے ۔ کہیں دیوار کا دھڑکا، حویلی والے در در رو رہے ہیں اور مفلس بیفکری سے اپنے جھونپڑے میں پڑے سوتے ہیں ۔ جن کے مکان پرانے ہیں آٹھ آٹھ کر بار بار چھت پر جاتے ہیں کہ جہاں نہاں سوراخ یا دراریں ہوں تو بند کردیں، کسی طرف سے آواز آتی ہے کہ ٹک موری کھول دینا، کسی کی چھت سے مٹی گر رہی ہے ۔ کسی کی اٹاری چھلنی ہوچکی ہے ۔ غرض برسات میں زندگی کا ایک رخ یہ بھی ہے ۔ اس میں نظیر نے کسی شاعرانہ مبالغے یا تخیل کے زور سے کام نہیں لیا ہے ۔ صرف مشاہدہ کی قوت اور تحلیل و تجزیہ کی عادت کے باعث یہ دلچسپ منظر نظم ہوگیا ہے ۔

اب بعض اور مختلف ملے جلے مناظر دیکھئے :—

ہیں جن کے تن ملائم میدے کی جیسے لوئی
وہ اس ہوا میں خاصی اوڑھے پھرے ہیں لوئی
اور جن کی مفلسی نے شرم و حیا ہے کھوئی
ہے اُن کے سر بہ سر کی یا بوریے کی کھوئی
کیا کیا . . . . .

جو اس ہوا میں یارو دولت میں کچھ بڑھے ہیں
ہے اُن کے سر پہ چھتری ھاتھی اُپر چڑھے ہیں
ہم سے غریب غربا کیچڑ میں گر پڑے ہیں
ھاتھوں میں جوتیاں ہیں اور پائینچے چڑھے ہیں
کیا کیا . . . . .

کتنے خوشی سے بیٹھے کھاتے ہیں خوش محل میں
کتنے چلے ہیں لینے بنیے سے قرض پل میں
کاندھے پہ دال آٹا ہلدی گرہ ے مل(؟)[1] میں
ہاتھوں میں گھی کی پیالی اور لکڑیاں بغل میں
کیا کیا .....

یوں تو نظیر نے ہر جگہ انسان دوستی اور انسانی مساوات کے گیت گائے ہیں لیکن یہاں جو انداز اختیار کیا ہے اس میں بہ یک وقت شوخی اور تیز طنز موجود ہیں، ایک ہی سر زمیں پر بسنے والے ایک ہی طرح کے انسان لیکن دونوں کے لئے دنیا الگ الگ ہے۔

یہ منظر بھی رخصت ہوتا ہے اور ایک ایسا منظر آتا ہے جسے دیکھ کر شاید ثقہ لوگ لاحول پڑھنے لگیں اور آنکھیں بند کرلیں، یہ منظر رنڈیوں سے متعلق ہے اور دوسرے مناظر کے مقابلہ میں زیادہ طویل اور مفصل ہے۔ ظاہر ہے رنڈیوں کی گفتگو، ان کے مذاق، فقرے بازیاں، پھبتیاں، عشاق سے ان کی فرمائشیں اور لگاوٹیں بعض نستعلیق طبیعتوں پر بار گزریں گی لیکن نظیر جو ایسی محفلوں میں شریک ہوتے تھے اور کم از کم موتی ناسی طوائف سے ان کی لگاوٹ خود ان کے کلام سے ثابت ہے ان محفلوں کو کیسے بھول سکتے تھے، یہاں بھی نظیر نے جزئیات نگاری سے کام لیا ہے اور بعض فقرے ایسے بھی لکھ گئے ہیں جن کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا اور نظیر پر عامیانہ ابتذال کا الزام بھی نہ آتا۔

برسات کے سلسلے کی دوسری دلچسپ نظم ''برسات اور پھسلن'' کے عنوان سے ہے' نظم خاصی طویل ہے صرف دو بند دیکھئے :—

کوچے میں کوئی اور کوئی بازار میں گرا
کوئی گلی میں گر کے ہے کیچڑ میں لوٹتا
رستے کے بیچ پاؤں کسی کا رپٹ گیا
اس سب جگہ کے گرنے سے آیا جو بچ بچا
وہ اپنے گھر کے صحن میں آ کر پھسل پڑا

---

۱ - کئی نسخوں میں دیکھا اس کی تصحیح نہ ہوسکی۔

دلدل جو ہو رہی ہے ہر اک جا پہ رسمسی
مرمر آٹھا ہے سرد تو عورت رہی پھنسی
کیا سخت مشکلات ہے کیا سخت بیکسی
اس کی بڑی خرابی ہوئی اور بڑی ہنسی
جو اپنی جاضرور کے اندر پھسل پڑا

اس نظم میں بھی چار بند جو رنڈیوں سے متعلق ہیں ایسے ہیں جن میں نظیر ذرا زیادہ کھل گئے ہیں برسات کے موسم میں جب ابر گھرا ہو اور ہوا چلتے چلتے رک جائے تو عجیب قسم کی گرمی پڑنے لگتی ہے - اسی کو اومس کہتے ہیں - نظیر نے برسات کی اومس کے عنوان سے بھی ایک نظم لکھ ڈالی ہے -

ایدھر تو پسینوں سے پڑی بھیگے ہیں کھاٹیں
گرمی سے ادھر میل کی لچھ چیوٹیاں کاٹیں
کپڑا جو پہنیے تو پسینے آسے آٹیں
ننگا جو بدن رکھئیے تو پھر مکھیاں چاٹیں
برسات کے موسم میں نپٹ زھر ہے اومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اومس

اس موسم سے سب گھبراتے ہیں - نظیر بھی ضرور بیزار ہونگے لیکن آن کی طبیعی ظرافت یہاں بھی گلکاری کرتی ہے -

اومس میں لازم ہے نہ پنکھا نہ ہوا ہو
اک کوٹھڑی ہو جس میں دھواں آکے بھرا ہو
اور مکھیوں کے واسطے گڑ تن سے ملا ہو
اوس وقت مزا دیکھئے اومس کا کہ کیا ہو
برسات کے موسم .....

برسات کے لطف کے عنوان سے اس سلسلہ میں ایک نظم اور ہے - یہ نظیر کی اس قسم کے عام نظموں سے مختلف ہے اور پڑھنے والے کو قصیدوں کی بہاریہ تشبیب کی یاد دلاتی ہے - نظیر اپنی افتاد طبع ذاتی حالات اور واقعات کی وجہ سے قصیدہ گوئی کے خارزار میں الجھنے سے بچ گیا لیکن اس نظم کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس میدان میں آتے تو ان کا انداز کیا ہوتا۔

ساقیا موسم برسات ہے کیا روح افزا
دیکھ کچھ تازگیٔ صنعت بے چون و چرا
جابجا نکلے ہیں اس لطف سے طفلاں نبات
اپنے ہاتھوں سے کھلاتی ہے جنہیں نشو و نما
دیکھ سبزوں کی تراوٹ کو زمیں پڑھتی ہے
دم بدم انبتة الله نباتاً حسنا
کوہ و صحرا میں وہ سبزی ہے کہوں کیا گویا
مخمل تازہ کسی نے ابھی یاں دی ہے بچھا
ہے زمین چمن و باغ جو پانی سی سفید
ق
اس میں اب عکس ہر اک گل کا ہے یوں جلوہ نما
عقل کہتی ہے تامل سے جسے دیکھ کہ یہ
طشت بلور ہے اقسام جواہر سے بھرا
ہلتے اس لطف سے ہیں بھیگے ہوئے تازہ نہال
جیسی ہو نازنیں دلبر کے نہانے کی ادا

اس سلسلے کی ایک اور نظم جاڑے کی بہاریں ہیں۔ اس موضوع پر ہمارے اکثر شعرا نے طبع آزمائی کی ہے لیکن ایسی نظموں میں واقعی مناظر کی جگہ تخیل کی بلند پروازی اور مبالغے کے زور پر توجہ صرف کی گئی ہے ۔ نظیر نے یہاں بھی اپنا خاص انداز اختیار کیا ہے

جب ماہ اگھن کا ڈھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
دن جلدی جلدی چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
پالا بھی برف پگلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
چلا خم ٹھونک اچھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

دل ڈھو کر مار پچھاڑا ہو اور دل سے ہوتی ہو کشتی سی
تھر تھر کا زور اکھاڑا ہو، بجتی ہو سب کی بتیسی
ہو شور پھپھو ہو ہو کا اور دھوم ہو سی سی سی سی کی
کلے پر کلہ لگ کر چلتی ہو منہ میں چکی سی
ہر دانت چنے سے دلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

اس نظم کی سب سے نمایاں خصوصیت یہی ھے کہ الفاظ ایسے منتخب کئے ھیں جن کا صوتی تاثر جاڑے کی کیفیت کو اور زیادہ نمایاں کرتا ھے -

ان نظموں کے مطالعہ سے معلوم ھوتا ھے کہ اردو شاعری کا دامن اعلیٰ درجے کی منظر نگاری سے خالی نہیں ھے - یہ اور بات ھے کہ یہ منظر نگاری قصیدوں اور مثنویوں میں محض ذیلی حیثیت سے آئی ھے اور بعد میں مرثیہ گو شعرا نے بھی اسے اپنے موضوع کے ساتھ محض ذیلی اور ثانوی حیثیت سے اختیار کیا ھے، اس کا سبب در اصل ان اصناف کی عام مقبولیت ھے اور کمتر شعرا باوجود اپنے شاعرانہ کمال کے اپنے عہد کی روایات سے آزادی میں کامیاب ھوسکے لیکن یہ صورت حال شمالی ھند کے شعراء میں ولی کے عہد سے نظیر تک قائم رھتی ھے - ولی سے پہلے دکھنی شعرا نے خالص مناظر فطرت پر اعلی درجے کی نظمیں لکھی ھیں سلطان محمد قلی قطب کی کلیات میں ھندوستان کے مختلف موسموں، تیوھاروں اور تقریبوں پر بکثرت نظمیں موجود ھیں - نظیر کے بعد حالی تک پھر یہ میدان خالی نظر آتا ھے - اور لاھور کے تاریخی مشاعرے کے بعد جس میں آزاد اور حالی نے ھالرائڈ کی تجویز پر غزلیں کہنے کی بجائے برسات پر نظمیں لکھیں اس رنگ کی تجدید ھوئی اور آن سے یہ سلسلہ چکبست، اقبال اور جوش تک پہنچا ھے -

نظیر کے مجموعہ کلام میں بعض نظمیں ایسی ھیں جو بالکل فحش نگاری کے تحت میں آتی ھیں، مثلاً ایک نظم کا عنوان ''لولی پیر'' ھے جس میں بوڑھی طوائفوں کے حال زار کا نقشہ کھنچا ھے ایک اور نظم میں جو اس مصرعے سے شروع ھوتی ھے -

ع بیٹا ھوا کسی سے جو سن پاویں ھیجڑے

ھیجڑوں کی ھیئت کذائی پر طنز کیا ھے - اس سلسلے کی تین نظمیں[1] فحش نگاری کی انتہا ھیں اور شاید ھی کسی معقول شاعر کے یہاں آن کی مثال مل سکے، غالباً نظیر اپنی ان ھی چند نظموں کی

---

۱ - کلیات نظیر مطبوعہ نولکشور ۱۹۵۱ صفحہ ۶۹۱ تا صفحہ ۶۹۶

وجه سے اس قدر معتوب ہوئے ہیں کہ ناقدین نے انہیں سنجیدہ اور معقول شعرا کی فہرست سے خارج کرکے اُن کو اوباش اور اُن کے کلام کو پست اور عامیانہ قرار دیا ہے ۔ ان نظموں کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں اور نہ کسی طرح ان کی تاویل کی ضرورت ہے ۔ البتہ اس کے اسباب پر نظر ڈالنے سے اُس تحت شعوری ذہنی رو کا پتہ چل سکتا ہے ۔ جو کہیں فحش گوئی، کہیں ہزل، کہیں معاملہ بندی اور کہیں بقول میر محض چوما چاٹی اور کہیں امرد پرستی کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور شاید ہی اس دور کا کوئی ایسا شاعر نکلے جس کے کلام میں اس رو کی کچھ نہ کچھ جھلک موجود نہ ہو، سودا کی ہجویہ شاعری میں بھی ایسے نمونے ہیں جن کے سامنے نظیر کا یہ کلام کچھ حقیقت نہیں رکھتا، مثلاً مخمس، ہجو مولوی ندرت کشمیری

ع ندرت ہے ایک بھڑوا کاشو ہے ایک مدنا

مخمس در ہجو شیخ کہ ہر چند دوستان مانع کتخدائی شدند ایشان قبول کردند ۔

ع جب میں سنا کہ بیاہ رچاتے ہیں شیخ جی

مخمس در ہجو میر ضاحک کہ خود را از دیگراں در تر زبانی بہتر میدانستند ۔

ع ضاحک کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر دھرایا

مخمس دیگر در ہجو ہمیں ضاحک بمضمون عجیب و غریب بیان نمود ۔

ع یا رب تو میری سن لے یہ کہتا ہے سکندر

مخمس دیگر بطرز رنگین مضحک در حق فدوی پنجابی شاعر

ع جہاں میں کون بناتا ہے آلو بنئے کا

ترجیع بند در حق شاعرے عجیب کہ تخلص غریب ایشاں ضاحک است ۔

ع جا صبا ضاحک سے کہہ بعد از سلام

مثنوی در هجو طفل ناشایسته کردار که خلاف گفته پدر بعمل آورده خراب شد ـ

ع نالہ پر ایک لڑکا رہتا تھا

مثنوی دیگر در هجو کودکی معه مادرش که دل درد منداں را خوشنماید ـ

اِن نظموں میں جو فحش اشعار ہیں اُن کی تعداد نظیر کے اس قسم کے اشعار سے بہت بڑھ جاتی ہے اور ان میں بھی مطبوعہ نسخوں میں بہت سے اشعار حذف کر دئے گئے ہیں۔ راقم کے پاس کلیات سودا کا ایک قلمی نسخہ ہے جس میں یہ تمام نظمیں مکمل موجود ہیں، ان کو پڑھ کر شرم کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور حیا کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہے ـ لیکن آج تک کسی نے سودا کو اوباش نہ کہا اور نہ ان کے کلام کو عامیانہ قرار دیا گیا،

اس سلسلے میں سودا اور نظیر کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا کی اس ہجو نگاری کے محرکات زیادہ تر شخصی اور ذاتی تھے، نظیر کی مذکورہ بالا نظمیں رنڈیوں اور ہیجڑوں پر نشتر زنی کرتی ہیں، سودا کی نظمیں مشاعروں میں بھی پڑھی گئیں چنانچہ ضاحک والی ہجو کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ ضاحک اسے سن کر برسر محفل سکندر سے اینٹ گئے تھے، میر حسن نے اس سلسلے میں اپنی ضرب المثل شرافت اور سیادت کو بالائے طاق رکھ کر جواب میں ایک مخمس کہا جس کا ٹیپ کا مصرعہ ہے ع

.. ..ترا ڈرے ہے .. .. یہ ہے سکندر

میر حسن کا پورا کلام شائع نہیں ہوا لیکن قلمی نسخوں میں یہ مخمس اور اس قسم کی کئی نظمیں موجود ہیں میر کی امرد پرستی کا مضمون کچھ چھپا دبا نہیں، ڈاکٹر عندلیب شادانی اپنے مضمون مطبوعہ ساقی دہلی میں اس پر تفصیل سے اظہار خیال کر چکے ہیں، مصحفی جیسا متین و متوازن طبیعت رکھنے والا شاعر بھی اس سے محفوظ نہ رہا، جرأت کے کلام میں ان مضامین کی جو

کثرت ھے اسے میر نے چوما چاٹی کہا تھا اور سچ کہا تھا، کلیات انشا[1] میں ایک حکایت ھے جس کا آغاز اس شعر سے ھوتا ھے

مرد تھا ایک ایک تھی رنڈی پر وہ رنڈی تھی مرد سے سنڈی،

اس میں انشا نے جو گل کھلائے ھیں اُن کے سامنے نظیر پر اوس پڑ جاتی ھے، ایک دوسری مثنوی 'فیل' کے عنوان سے ھے جس میں دسمبر ۱۷۹۲ء کے تاریخی حوالہ سے ایک ھاتھی اور ھتھنی کی جفتی کی داستان نظم کی ھے[2] وہ بھی اسی رنگ میں ھے لیکن اس کی انتہا ''در ھجو گیان چند ساھوکار، میں ھوتی ھے جس کا ابتدائی مصرعہ ھے ع

ایک تھا بیٹا ساھوکار کا ۔ نام تھا اس کا گیان چند

لیکن انشا اُن متفرق نظموں سے بہت آگے بڑھ گئے ھیں، ریختی کے دیوان کے نام سے انھوں نے جو مجموعہ نظم کیا ھے وہ ان کی ذھنی کیفیت کے ساتھ ساتھ یقینی طور پر اس دور کی مریضانہ ذھنیت کا ترجمان ھے ریختہ کے مقابلہ میں ریختی صرف بیگماتی محاورے کا نمونہ نہیں ھے بلکہ اس میں رنڈیوں کی بجائے خانگیوں کی ھوس پرستی کو مزہ لے لے کر بیان کیا گیا ھے ۔ یہی کیفیت سعادت یار خاں رنگین کے کلام کی ھے ۔ دیوان ریختی ان کے یہاں بھی ھے اور اس کے علاوہ ھجویات و حکایات میں بھی نہایت غلیظ قسم کی فحش نگاری موجود ھے ۔

ھمارے بعض شعرا اُس گندگی اور بے راہ روی کو لکھنؤ کے دبستان شاعری سے وابستہ کرتے ھیں حالانکہ جن شاعروں کے کلام سے مثالیں پیش کی گئی ھیں وہ دھلویت کے علمبردار ھیں، لکھنو آ کر اُن کے بگڑے ھوئے مذاق کو اور ھوا لگی اور بجائے اصلاح کرنے کے وہ خود اس رو میں بہ گئے، اگر انیس و دبیر کی مرثیہ گوئی اور محسن کی نعت اس سیلاب کے خلاف مضبوط بند نہ کھڑے کرتی تو معلوم نہیں لکھنؤ میں اس آغاز کا کیا انجام ھوتا ۔

---

۱ - کلیات انشا، مطبوعہ نولکشور ۱۸۹۴ ص ۳٦٦

۲ - ص ۳۷۴

اس بیان سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس عہد میں سیاسی خلفشار، ذہنی انتشار، معاشی بد حالی اور سماجی بے اطمینانی نے ایک قسم کا اخلاقی دیوالیہ پن پیدا کردیا تھا جو بادشاہوں، امیروں وزیروں کے مشاغل اور ان کے درباری جلسوں جلوسوں سے نکل کر سماج کے تمام رگ و پے اور سب طبقوں کی میں سرایت کر گیا تھا، اور جس طرح زہر جسم میں داخل ہونے کے بعد طرح طرح سے فساد خون، پھوڑے پھنسی اور ناسور کی شکلوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے یہ فساد بھی اس عہد کی شاعری اور ادب میں پھوٹ پڑا ہے - ایسے کلام کو پڑھ کر نہ صرف اس عہد کے اخلاقی دیوالیہ پن کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معاشی بدحالی کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی جنسی نا آسودگی بھی پیدا ہوگئی تھی اور اس لئے جنسی خواہش اپنے اظہار اور تکمیل کے لئے غیر فطری طریقے اور راستے اختیار کر رہی تھی، اعلیٰ درجے کے فنون لطیفہ کی ترقی خاص ذہنی ماحول کا تقاضہ کرتی ہے اور جس طرح یہ دور اعلیٰ درجے کے سیاست دانوں، سپاہیوں اور مدبروں سے خالی ہے اسی طرح اعلیٰ درجے کے مصور نقاش اور خطاط بھی پیدا نہیں ہوئے، جو زمانہ مغلوں کی سیاسی تاریخ میں انتہائے عروج ہے اسی میں تاج محل کی تخلیق ہوئی اور اسی میں تان سین پیدا ہوا، جب یہ دور گزر گیا تو رد عمل شروع ہوا اور وہ مریضانہ ذہنیت پیدا ہوگئی جس کا ایک مظہر اس انداز کی شاعری ہے - انشا اور رنگین کی ریختی پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مزہ لے لے کر فحش باتیں بیان کرتے ہیں - ان کے یہاں فحش گوئی کی لذت بالذات مقصود ہے - نظیر کا کلام اس سے مختلف ہے، ہمیں ان نظموں کو پڑھ کر نظیر کی بجائے ان حالات سے نفرت پیدا ہوتی جس میں نظیر کی شخصیت اس پستی تک اتر آنے پر مجبور ہوئی، لیکن انہوں نے اس پستی کو چھپانے کے لئے مکر و فریب کے پردے نہیں ڈالے ہیں، تصوف کی آڑ لے کر امرد پرستی کے مزے نہیں لئے ہیں اور نہ مسخرہ بن کر خود ننگا ہونے اور دوسروں کو ننگا کرنے کی کوشش کی ہے - اس لئے محض ان چند نظموں کے لئے خاص طور پر نظیر کو مطعون کرنا ناقدانہ دیانت داری سے بعید ہے - ایسے کلام کو اسی سلسلے

کی ایک کڑی سمجھنا چاہئے جس میں میر، سودا، مصحفی، میر حسن، انشا اور جرات کا کلام آتا ھے ۔ اس کے مقابلہ میں اعلیٰ درجے کی شاعری کے جس قدر عناصر نظیر کے یہاں ھیں وہ اور کہیں نہیں ملتے اور نظیر کی بڑائی اسی میں مضمر ھے ۔

نظیر کوئی حکیم یا فلسفی نہ تھے، کہ ان کے کلام میں کسی خاص نظریہ حیات کی تلاش کی جائے وہ سیدھے سادھے دنیا دار انسان تھے لیکن اُن کا مشاھدہ تیز اور تحلیل و تجزیہ کی قوت بے پناہ تھی اس لئے انہوں نے اپنے ماحول کا جس طرح جائزہ لیا ھے اور جو نتیجے نکالے ھیں اسی کو ھم ان کا فلسفہ کہہ سکتے ھیں ۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ھے ان کے نزدیک دنیا کا کارخانہ پیسے پر چلتا ھے نیکی اور برائی کا سرچشمہ معاشی حالات ھیں، عبادت، ریاضت، زھد، نیکی سب اسی وقت ممکن ھیں جب پیٹ بھرا ھو، بھوک نظیر کے یہاں صرف ایک نعرہ نہیں تلخ حقیت ھے جس سے انہیں دو چار ھونا پڑا، نظیر کی جن نظموں کا تجزیہ کیا گیا اُن سے اس خیال کی تائید ھوتی ھے ان نظموں میں خلوص ھے ، سچائی ھے، حقیقت ھے، واقعیت ھے اور یہی وجہ ھے کہ پڑھنے اور سننے والے ان سے متاثر ھوئے ھیں ۔

نظیر کی نظمیں پیمانوں اور موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے ایسی ھیں کہ انہیں دور قدیم میں اردو کا سب سے بڑا نظم گو شاعر قرار دینا مبالغہ نہ ھوگا اور دور جدید میں بھی اقبال اور چند دیگر مستثنیات کو چھوڑ کر شاید ھی ان کا کوئی مقابل نکلے، اس عظمت کا احساس اور بھی بڑھ جاتا ھے جب ھم یہ دیکھیں کہ اس بارے میں نظیر نے روایت شکنی کی ھے ۔ ولی کے شمالی ھند میں آنے اور پھر ان کے دیوان کے اشتہار پانے کے بعد اردو شاعری کے جس دور کا آغاز ھوا وہ بنیادی طور پر ریختہ یعنی اردو غزل کا دور تھا ۔ ولی کے شمالی ھند کے مقلدین میں آبرو، مضمون، شاکر ناجی، یکرنگ اور احسن تھے ان سب نے غزلیں کہیں اور ایک نیا انداز پیدا کرنے کی کوشش میں زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ ایہام گوئی اختیار کی، ایہام گوئی سے نہ غزل کی معنویت میں اضافہ ھوا اور نہ اسلوب بیان کو ترقی ھوئی اس مصیبت سے مرزا مظہر جانجاناں اور خان آرزو نے نجات دلائی ان بزرگوں کا اردو سرمایہ بہت کم ھم تک پہنچا ھے اور جو ھے

اس میں غزل کے سوا اور کچھ نہیں، بیان کی صفائی اور سادگی البتہ پیدا ہو چلی ہے - اور اس کے بعد حاتم ہیں جنھوں نے اپنا اردو کلیات مرتب کیا، یہ اُن کے منتخب کلام کا مجموعہ دیوان زادہ ہے اور یہ بھی غزلوں کا مجموعہ ہے، حاتم کے بعد اُن کے شاگرد سودا اور میر کا زمانہ آتا ہے - میر غزل کے بادشاہ ہیں اور اُن کے کلام سے اردو غزل کی روایت میں پختگی کا شعور پیدا ہوتا ہے - انہوں نے چند عشقیہ مثنویاں بھی کہیں اور بعض نظموں میں اپنے ذاتی حالات اور واقعات بھی بیان کئے، اسے چاہے تو دکھنی دور کے بعد شمالی ہند میں نظم گوئی کے تاریخی آثار کی حیثیت سے تسلیم کر لیجئے - ان کے بعد سودا ہیں جن کی ساری دھوم دھام اُن کے قصاید، یا ہجویات پر منحصر ہے اگرچہ یاروں نے انہیں غزل کا امام بنانے کی بھی کوشش کی ہے اور وہ خود بھی کبھی کبھی میر کے مقابلہ میں آئے ہیں لیکن اُن سے بھی نظم گوئی کی کوئی روایت مستحکم نہ ہو سکی میر حسن نے سحر البیان کہہ کر منظر نگاری اور جذبات نگاری کا ایک نیا انداز پیدا کیا لیکن قصہ، افراد قصہ کا انتخاب اور خود مثنوی کا پیمانہ غمازی کرتے ہیں کہ وہ بھی ایک روایت سے آگے نہ بڑھ سکے، یہی حال مصحفی، جرآت اور انشا کا ہے - اس دور میں نظیر کا وجود ایسا ہی ہے جیسے ایک پھیلے ہوئے ریگستان میں ہرے بھرے نخلستان کا ہوتا ہے - اُن کی تعلیم بھی واجبی تھی، خاندانی سیادت یا شرافت پر بھی انہیں ناز نہ تھا، کسی خان یا مرزا کی ملازمت سے بھی ان کے توقیر میں اضافہ نہ ہوا تھا - وہ عوام کی سطح پر تھے اور اس عہد کے عوام خود اس درجہ پست تھے کہ وہ نظیر کو کوئی خیال انگیز تحریک نہیں دے سکتے تھے - نظیر نے جو کچھ کیا اپنی فطری صلاحیتوں کی بناء پر کیا اور غزل کی مسلمہ روایات سے انحراف کر کے اپنی زندگی کا بڑا حصہ اور اپنے کلام کی بیشتر مقدار مسلسل نظموں پر صرف کی، جس میں جھوٹے قصے کہانیوں اور فرسودہ عشقیہ داستانوں کی جگہ روزمرہ زندگی کے مسائل نے لے لی ہے، ان کی پیش کردہ تصویروں میں سے بعض بلاشبہ مکروہ ہیں لیکن اُن کی صحت سے انکار نہیں کیا

جاسکتا اور اگر حسن و صداقت کو لازم و ملزوم قرار دیا جاسکتا ہے تو یقیناً نظیر کی ان تصویروں میں حسن بھی ہے اور بغاوت تو ان میں قدم قدم پر ملتی ہے ۔ مصنوعی اخلاقی تصورات سے بغاوت، ایسے تصورات جو خوش کن الفاظ کے پردوں میں لپٹے ہوئے ہیں لیکن جن کی تہ میں بھیانک گندگی پوشیدہ ہے بڑے بڑے شاعر اور ادیب زندگی کی شاہراہوں پر سے گزرتے ہیں اور گندگی کے چھہ بچوں کو خس و خاشاک سے ڈھکے چلے جاتے ہیں کہ اُن کی بدبو ان کے نازک دماغوں پر بار نہ گزرے نظیر اس سے بغاوت کرتا ہے ، وہ اس گندگی کو گندگی کی طرح سونگھتا ہے اور دوسروں کو سنگھاتا ہے ۔ یہ اس کا قصور نہیں کہ یہ بو دماغ کو پراگندہ کرتی ہے ۔ یہ اُن سر چشموں کا قصور ہے جہاں سے یہ گندہ پانی آکر ان گڈھوں میں جمع ہوا ہے اور اُن لوگوں کا قصور ہے جنھوں نے اسے خشک کرنے کی بجائے ڈھک کر رکھا ہے اور عمل کی جگہ فرار کی راہ اختیار کی ہے ۔ عمل نظیر کے یہاں بھی نہیں لیکن اس کے یہاں ان حقیقتوں سے فرار بھی نہیں ہے ۔

نظیر سیاسی باغی نہیں ہے ۔ اول تو وہ دور سیاسی شعور کی بیداری کا نہ تھا اور ہوتا بھی تو شاید نظیر اس جہاد کے لائق نہ تھا لیکن اس نے چھوٹے، بڑے، امیر، غریب، طاقتور اور کمزور کی تقسیموں کے خلاف بغاوت کی ہے ۔ آدمی نامہ انسان دوستی کا ایسا منشور ہے جس میں نظیر کی زبانی پہلی مرتبہ اردو میں انسان اور محض انسان کا تصور ہمارے سامنے آتا ہے ۔ انسان جو شیطان بھی ہے اور رحمان بھی، جو عرش اعلی کی بلندیوں تک بھی پہنچ سکتا ہے اور تحت الثریٰ کی پستیوں تک بھی گر سکتا ہے وہ انسان جو مسجد بناتا ہے اور وہ جو نماز پڑھتا ہے اور وہ جو ان کی جوتیاں چراتا ہے اور وہ جو جوتیاں چرانے والے کو بھانپتا ہے اور وہ جو ان کو گرفتار کرتا ہے ۔ اعلیٰ و ادنیٰ فقیر و امیر، عالم و جاہل، کافر و مومن ۔ سب آدمی ہیں ۔ شاعری میں یہ تحریک ایک زبردست بغاوت ہے ۔ میر اپنی سیادت پر ناز کرتے ہیں، وہ اپنے شعر کو ع مستند ہے میرا فرمایا ہوا قرار دیتے ہیں، سودا اپنے زور کلام میں پہلوانوں کو ہیچ سمجھتے ہیں، انشا کی ظرافت اور شوخی

طبع کے سامنے مصحفی مرد مسکین نہاد نظر آتا ہے لیکن یہی مصحفی اپنے مقابلہ میں حریفوں کو حقیر سمجھتا ہے۔ نظیر اس قسم کی کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں، نہ اُس کے یہاں تعلی ہے نہ حریفوں سے کشمکش، اس لئے نہ کبھی اس نے کسی کی ہجو کہی اور نہ کسی کو اس کی ہجو کہنے کی نوبت آئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بارہ میں بھی وہ میر، سودا، میر حسن، انشا، مصحفی اور جرأت سے بلند تر کردار کے مالک ہیں اپنی ہجویات میں یہ لوگ جس طرح ایک دوسرے کی ٹوپی اچھالتے ہیں وہ سب کو معلوم ہے، خواجہ میر درد نے البتہ اس آلودگی سے اپنا دامن بچایا ہے لیکن وہ صوفی منش بزرگ تھے، صاحب سجادہ تھے، پیر طریقت تھے، انہوں نے ایسا کیا تو کوئی بڑا کمال نہیں کیا، نظیر اُن کے مقابلے میں بازاری تھے، پھکڑ تھے، اوباش تھے، جب ہجوگوئی کی محفل ایسی گرم تھی تو کوئی تعجب نہ ہوتا اگر وہ بھی اس میدان میں اتر آتے اور اگر ایسا ہوتا تو یقیناً اس بات میں بھی کوئی اُن سے بازی نہ لے جا سکتا۔ غرض یہ بات نہایت اہم اور قابل غور ہے کہ نظیر کا دامن اس آلودگی سے پاک ہے جس سے بڑے بڑے پاکیزگی کے دعویدار بھی محفوظ نہیں رہ سکے ہیں۔

اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے معاملات میں نظیر کبھی ذاتیات کے جھگڑے میں نہ پڑے وہ اپنے حال میں مست تھے اور اگر انہیں کوئی تکلیف ہوتی تو وہ اسے براہ راست اپنے ماحول اور زمانے کے حالات پر مبنی سمجھتے، وہ اپنے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے اور نہ انہیں کسی سے مقابلے کا شوق تھا وہ کسی دربار کی رونق نہ تھے بلکہ اپنی انجمن آپ تھے اور اگر اُن کی کوئی انجمن تھی تو وہ عوام کے میلے ٹھیلے تھے جن میں گالی گلوج اور فحش گوئی کا مقصد بھی کسی کی دل آزاری یا دل شکنی نہیں ہوتا، جہاں فقرے بازی کا مطلب صرف قہقہے لگانا اور گالی گلوج کا مدعا صرف خوش باشی ہوتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اگر نظیر نے اپنے آپ کو عوام سے اس درجہ وابستہ نہ کر لیا ہوتا تو شاید ان کے کلام میں وہ عنصر نہ ہوتا جسے 'عامیانہ' کہتے ہیں لیکن اس طرح وہ زندگی کی بہت سی حقیقتوں کا شاید مطالعہ بھی

نہ کر پاتے اور اُن کی شاعری میں یا تو وہ رنگ ھوتا جو صرف درباری ھے اور یا پھر ایسی گوشہ نشینی کی ترجمانی ھوتی جہاں حقایق و معارف تو ملتے ھیں لیکن زندگی کی کوئی جھلک نہیں پائی جاتی، اس کا دوسرا پہلو یہ ھے کہ نظیر جب اپنی زندگی کے مطالعہ میں مصروف نظر آتے ھیں تو اس میں بھی ایک عجیب خلوص پایا جاتا ھے، میر، مصحفی اور میر حسن نے اپنی پریشان حالی کا نقشہ کھینچنے میں اپنے اپنے مکانوں کا حال نظم کیا ھے ۔ ان تمام نظموں سے شعرا کی زبوں حالی کا احساس تو ھوتا ھے لیکن اس میں مبالغہ کی ایسی کثرت ھے جو اس اثر کو کم کردیتی ھے ۔ ایک مجلس میں میر، میر حسن اور مصحفی کی یہ تینوں نظمیں زیر غور تھیں، ایک ناقد نے بڑے پتے کی بات کہی کہ ان لوگوں نے کوڑے کرکٹ کی کثرت اور مکڑیوں کے جالوں کی زیادتی وغیرہ کا جو بیان کیا ھے اس سے کچھ ایسا معلوم ھوتا ھے کہ یہ لوگ طبعاً ایسے مکانوں کو پسند کرتے تھے اور یہی وجہ ھے کہ اس سے ان کی کاھلی، تن آسانی، اور نحوست کا احساس ھوتا ھے ۔ یہ لوگ اس حالت کا شکوہ اور شکایت تو ضرور کرتے ھیں لیکن ذوق عملی سے محروم ھیں وہ اس حالت کو بدلنے کے لئے ھاتھ پیر ھلانے کی کوشش نہیں کرتے ۔ اسے قناعت، توکل اور استغنا کی بجائے بے عملی کہنا زیادہ مناسب ھے ۔ در اصل اس میں بھی اس عہد کے ذھنی اور سیاسی حالات کی ترجمانی ھوتی ھے ۔ قوت عمل کا جو فقدان زندگی کے تمام دوسرے شعبوں میں نظر آتا ھے وھی شاعری میں جھلکتا ھے ۔ ایسا معلوم ھوتا ھے کہ ساری جسمانی اور ذھنی قوتیں شل ھو چکی ھیں ۔ شاید ایک سبب یہی ہے کہ اس دور میں شاعری کو زیادہ فروغ ھوتا ھے اور شعرا کے عمل اور قوت کا اظہار اسی محدود دائرہ میں ھوتا رھتا ھے اور یہاں بھی وہ حرکت عمل جد و جہد اور عزم و استقلال کی تلقین کرنے کی بجائے صرف مرثیہ پڑھتے نظر آتے ھیں ۔ یہ مرثیہ پن اور ماتمیانہ کیفیت اس دور میں شاعری کی تمام اصناف اور تمام شعراء کے یہاں بطور قدر مشترک پائی جاتی ھے ۔

نظیر کی غزلیں

نظیر کی نظموں کی شہرت نے ایک عرصہ تک اُن کی غزلوں پر پردہ ڈالے رکھا ، اسکا ایک سبب یہ بھی تھا کہ کلیات نظیر کے ابتدائی ایڈیشنوں میں غزلوں کی تعداد بہت کم تھی' جو کلیات پہلی مرتبہ مطبع الہی کنبوہ دروازہ میرٹھ سے شائع ہوا تھا اس میں غزلوں کی تعداد چالیس سے زیادہ نہ تھی* ، مختلف ذرائع سے یہ معلوم تھا کہ نظیر کے دو مکمل دیوان غزلیات کے بھی تھے لیکن پروفیسر شہباز جنہوں نے بڑی محنت سے کلیات نظیر کا ایک نسخہ مرتب کیا تھا وہ بھی ان دونوں کا پتہ نہ چلا سکے اور اتفاقاً یہ دونوں نایاب دیوان آغا حیدر حسن دھلوی کے کتب خانہ سے قلمی نسخوں کی صورت میں مرزا فرحت اللہ بیگ کو دستیاب ہوگئے چنانچہ انہوں نے مرتب کرکے ان دونوں کو انجمن ترقی اردو سے ۱۹۴۲ء میں شائع کرا دیا ۔ نول کشور کے ۱۹۵۱ء والے اڈیشن میں کلیات کے ساتھ یہ بھی شامل ہیں اور متفرقات کے علاوہ ۳۵۹ مکمل غزلیں ردیف وار موجود ہیں ، ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ھے کہ نظیر نے غزلیں بھی خاصی کہی ہیں اور کلام کا یہ حصہ بھی قابل اعتنا ھے ۔ نظیر اگر غزل کی طرف توجہ نہ کرتے تو یہ بات بڑے تعجب کی ہوتی ۔ انکا زمانہ اردو شاعری میں غزل کے شباب کا دور ھے ، میر کے آخر دور سے لکھنؤ کے ابتدائی دور تک چند مثنویوں اور قصیدوں کو چھوڑ کر اردو شعرا کا سرمایہ کمال غزلیں ھی ہیں ، مشاعروں میں غزلیں ھی پڑھی جاتی تھی اور تذکروں میں غزلوں کے اشعار ھی نقل ہوتے تھے ، غرض اس دور کی شاعری غزل اور اس دور کی تنقید بڑی حد تک غزل کی تنقید ھے ۔

غزل میں نظیر کا کلام بادی النظر میں عام روش سے الگ نہیں ھے اور ایسا ہونا دشوار بھی تھا شمالی ھند میں ولی سے لے کر میر و مرزا کے عہد تک اردو غزل کا ایک خاص انداز پیدا ہو گیا تھا ، غزل کی ایک

---

* مقدمہ کلیات نظیر ، نولکشور اڈیشن ۱۹۵۱ صفحہ ۱۶

روایت بن چکی تھی ، ولی کے یہاں سعد اللہ گلشن کے مشورہ کے مطابق فارسی کے مضامین اور اردوئے معلی کا محاورہ اختیار کیا جا چکا تھا ، آن کے بعد آنے والے شعرا نے اسی روایت کو پروان چڑھایا اور مضامین کے اعتبار سے نیز الفاظ ھندی ترک کر کے فارسی الفاظ محاورات تراکیب اور فارسی محاوروں اور ترکیبوں کے ترجموں سے اردو غزل کو فارسی کا ھم پایہ وھم پلہ بنا دیا تھا ، اس طرح نہ صرف غزل کا ایک موضوع بلکہ اسکا اسلوب بھی متعین ھو چکا تھا ، اس اسلوب کی ایک مثال میر تقی میر کا کلام ھے ، اس کے علاوہ غزل کا ایک پہلو اور بھی تھا ، غزل کا رکھ رکھاؤ اور غزل کے اسلوب میں وضع‌داری در اصل اس درباری فضا کا اثر تھا جس میں غزل پروان چڑھی تھی ، سوائے خواجہ میر درد کے ھمارے سارے غزلگو شاعر کسی نہ کسی دربار سے وابستہ تھے اور اس لئے ان میں بھی ایک خاص طرح کی وضعداری پیدا ھوگئی تھی ، یہ سب کے سب اپنے آپ کو ایک معزز طبقے میں شمار کرتے تھے جس کی سطح عوام سے بلند تھی ، ان کے نزدیک شاعری (جس سے ان کی مراد غزل ھوتی) صرف شرفا کا پیشہ تھی، جلاھوں اور ندافوں کو اس سے کیا کام ھو سکتا تھا ، نظیر بیچارے جو غزل سے زیادہ نظم کی طرف مائل ھوئے اور اس میں بھی موضوعات اور اسالیب کے اعتبار سے ' طریقہ راسخہ شعراء ' اختیار نہ کیا اس کا سبب یہ تھا کہ وہ کسی رئیس کے درباری نہ تھے - عمر بھر معلمی کرتے رھے اور اسی میں مست رھے لیکن جب غزل لکھنے بیٹھے تو انہیں بھی مجبوراً وھی طریقہ راسخہ شعرا اختیار کرنا پڑا ، ایک بات البتہ یہ ھوئی کہ یہاں بھی آن کی طبیعت کا زور رنگ دکھاتا ھے ان کی غزل محض رسمی یا تقلیدی نہیں بڑی جاندار ھے اور اگر آنہیں میرو درد کے برابر نہیں تو کم از کم مصحفی کے ھم پلہ ضرور قرار دینا پڑتا ھے

غزل کے مضامین میں سب سے پہلے ھماری نظر حسن اور اس کی کرشمہ سازیوں پر پڑتی ھے - یہاں بعض مضامین اور موضوعات تو رسمی ھیں اور بعض میں نظیر کی انفرادیت اور شخصیت جھلکتی نظر آتی ھے ، اس سلسلہ میں پہلے ایک سراپا دیکھئے -

سحر جو نکلا میں اپنے گھر سے تو دیکھا اک شوخ حسن والا
جھلک وہ مکھڑے میں اس صنم کے کہ جیسے سورج میں ھو اجالا
وہ زلفیں اس کی سیاہ پرخم کہ ان کے بل اور شکن کو یارو
نہ پہونچے سنبل ، نہ پہونچے ریحاں ، نہ پہونچے ناگن ، نہ پہونچے کالا
ادائیں بانکی عجب طرح کی ، وہ ترچھی چتون بھی کچھ تماشا
بھنویں وہ جیسی کھنچی کمانیں ، پلک سناں کش ، نگاہ بھالا

یہ اور اس طرح کے کئی اشعار مضامین، تشبیات اور استعارات کے لحاظ سے محض رسمی ھیں لیکن آخری چند اشعار میں انکی جدت طبع رنگ دکھاتی ھے -

بہت یہ میں نے تو چاھا پوچھوں میں نام اسکا ولیے وہ گل رو
نہ مجھ سے بولا نہ کی اشارت ، نہ دی تسلی ، نہ کچھ سنبھالا

اب انہیں اس محبوب کے نام نشان ، ذات پات کا کچھ اتا پتہ نہ تھا ، اس لئے مختلف زبانوں میں اس پر اپنی کیفیت ظاھر کرنے کی کوشش کرتے ھیں کہ نہ معلوم ان میں سے کون سی زبان 'زبان یار' ھو

پری رخ من ، شکر لب من ، دمے تو باز آ بہ پیش چشمم
بیاد سرو تو بیقرارم ، نہال عشقت شدہ است بالا

فدائے وجھک ، عشی شرقا ، دموع نہراً و من فراقک
کثیر حزناً مع الھموم ثقیل ھجرا و کالجبالا

تسا دے ملنے نوں دل ھے بے کل ایہی او گلاں نت آکھدا ھے
سد اے مینوں دے اپنے گھر وچ نہیں تو اتھے اسا ڈے نال آ

تہاری آسا لگی ھے نس دن ، تہارے درشن کو ترسیں نیناں
دلارے سندر ، انوٹھے ابرن' ھٹیلے موھن ، انوکھے لالا

چھن کے من کوں جو چھننوں تھی اے یار کائیں لگائی اتنی
بھرایتیں آکر کھبر لو سہان کی پلک کٹارا جو تہان نے گھالا

اس طرح کے کئی اشعار اور ہیں۔

ایک اور سراپا ہے۔ انداز اس میں بھی روایتی ہے۔

دکھا کر اک نظر دل کو نہایت کر گیا بیکل
پری رو ، تندخو ، سرکش ، ہٹیلا ، چلبلا ، چنچل
وہ عارض اور جبیں تاباں کہ ہوں دیکھ اسکو شرمندہ
قمر ، خورشید ، زہرہ ، شمع ، شعلہ ، مشتری ، مشعل
کفوں میں انگلیوں میں لعل لب میں چشم میگوں میں
حنا آفت ، ستم فندق ، مسی جادو ، فسوں کاجل
بدن میں جامۂ زرکش ، سراپا جس پہ زیب آور
کڑے ، بندے ، چھڑے ، چھلے ، انگوٹھی ، نور تن ہیکل
نزاکت اور لطافت وہ کف پا تک کہ حیران ہوں
سمن ، گل ، لالہ ، نسرین ، نسترن ، در ، پرنیان ، مخمل

تیسرا سراپا ہے

کل نظر آیا چمن میں اک عجب رشک چمن
گل رخ و گلگوں قبا ، و گلعذار و گل بدن

اس میں سراپا کے عام مضامین ہیں ، محبوب مہر طلعت ، زہرہ پیکر مشتری رو ، مہ جبیں ، سیماب طبع ، سیم ساق ، سیم تن ہے۔ اسکا قد تیر ہے۔ نگہ نشتر ، مژگاں سنان ، ابرو کمان ، مشک تبت مشک چین مشک خطا اور مشک ختن یہ چاروں زلف و کاکل اور خال و خط کے چار غلام ہیں ، محبوب بے وفا ، بے مروت ، بے درد ، بے پروا خرام ، جنگجو ، قتال وضع ، تند خو ، دل شکن ہے۔ سختی اس کی معتمد بے رحمی موسی الیہ ، ظلم مستشار ، اور جفا موتمن ہے۔ غرض یہ محبوب اردو شاعروں کا مجموعہ اضداد محبوب ہے جس میں بقول حالی سوائے حسن کے کوئی شے مستحسن نہیں ، لیکن ان سے

ھٹ کر نظیر نے اپنے خاص انداز میں جہاں اس کی تعریف کی ھے وہ قابل دید ھے -

وہ گورا پنڈا اور اس میں سرخی مگر خدا نے لیے سرسے تاپا
کیا ھےمیدہ تو موتیوں کا اور اس کو گوندھا شہاب میں ھے

ایک سراپا سےیہ راز بھی منکشف ھوتا ھے کہ میاں نظیر '' ھیرا جان '' کی زلف گرہ گیر میں اسیر تھے ، سراپا میں کئی اشعار ھیں جن میں اس کے حسن و جمال اور نزاکت کی تعریف کی ھے ، اسی کا ایک شعر ھے

بلور کی پتلی کہوں یا موتی کا دانہ
یا چین میں اک چینی کی مورت یہ بنی ھے

آخر میں لکھتے ھیں -

کل میں نے کسی شخص سے نام اس کا جو پوچھا
یعنی یہ پری یا کہ غزال ختنی ھے
وہ بولا کہ اس شوخ کے تئیں کہتے ھے '' ھیرا ''
کام اسکا سدا دلبری و دل شکنی ھے
تب میں نے وھیں ھنس کے کہا اس سے نظیر آہ
' ھیرا ' نہ کہو اس کو یہ ھیرے کی کنی ھے

اسی طرح '' موتی '' کی تعریف میں بھی اشعار موجود ھیں -
سراپا نگاری سے ھٹ کر اس موضوع پر جو اشعار ملتے ھیں انکا نمونہ یہ ھے -

شبنم نے زیب جیسا پایا ھے گل سے ھمدم
لی پیرھن نے زینت ویسی ھی اس کے تن سے
تن پر اسکے سیم فدا اور منہ پر مہ دیوانہ ھے
سر سے لے کر پاؤں تلک اک موتی کا سا دانا ھے
تن بھی کچھ گدرایا ھے اور قد بھی بڑھتا آتا ھے
کچھ کچھ حسن تو آیا ھے اور کچھ کچھ اور بھی آنا ھے

وہ جب گھر سے نکلا لچکتے لچکتے
قدم بھی اٹھائے جھجکتے جھجکتے

کھلے بالوں میں منہ کی روشنی پھوٹ نکلتی ہے
تمہارا حسن تو صاحب اندھیروں کا اجالا ہے

نزاکت سر سے پاؤں تک پڑی قربان ہوتی ہے
الہی اس بدن کو تونے کس سانچے میں ڈھالا ہے

نہیں ھوا میں یہ بو نافۂ ختن کی سی
لپٹ ہے یہ تو کسی زلف پرشکن کی سی
خدا کے واسطے گل کو نہ میرے ھاتھ سے لو
مجھے بو آتی ہے ان میں کسی بدن کی سی
ھزار تن کے چلیں، بانکیے خوبرو لیکن
کسی میں آن نہیں تیرے بانکپن کی سی
گلوں کے رنگ کو کیا دیکھتے ہو اے خوبان
یہ رنگتیں ھیں تمہارے ھی پیرھن کی سی

نظیر کی غزلوں میں اعلٰی درجے کے عشقیہ مضامین کی تلاش بیسود ہے ۔ ان کی غزلوں کو پڑھ کر صاف معلوم ھوتا ہے کہ ان میں یا تو رسمی مضامین ھیں یا پھر معاملہ بندی کا رجحان ہے ۔ معاملہ بندی کے لئے بیچارے جرأت اور داغ تو ناحق بدنام ھوئے اس حمام میں اکثر غزلگو شعرا کا لباس پارسائی الگ اتار کر رکھدیا گیا ہے

نظیر کے یہ اشعار بھی ان غزلوں میں ھیں

رھے جو شب کو ھم اس گل کے ساتھ کوٹھے پر
تو کیا بہار سے گزری ہے رات کوٹھے پر

خدا کے واسطے زینے کی راہ بتلاؤ
ھمیں بھی کہنی ہے کچھ تم سے بات کوٹھے پر

آٹھ اشعار کی اس غزل میں ایسے ایسے مضامین ہیں کہ جرات کے سارے دیوان میں ڈھونڈے سے مشکل سے ملیں گے پھر ایک غزل سے تسلی نہ ہوئی تو قافیہ بدل کر اسی ردیف میں ایک اور غزل کہ ڈالی

کبھی تو آؤ ہماری بھی جان کوٹھے پر
لیا ہے ہم نے اکیلا مکان کوٹھے پر

لیکن اس کی انتہا اس غزل میں ہوتی ہے جس کی ردیف ''ازار بند'' ہے جس کے لئے اتنا ہی اشارہ کافی ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمام غزلیں بس اسی قسم کے مضامین پر مشتمل ہیں، میرو مرزا کے دور تک اردو غزل میں جو جو مضامین اور معاملات داخل ہوچکے تھے وہ سب نظیر کی غزلوں میں موجود ہیں، ان میں عشق و عاشقی کی کیفیات بھی ہیں، معاملہ بندی بھی، تصوف کے مضامین بھی ہیں اور اپنے زمانے کے عام حالات اور واقعات پر ایمائی انداز میں تبصرہ بھی، ان چند اشعار سے نظیر کی غزلوں کی گونا گوں کیفیات کا اندازہ لگائے۔

گر عیش و عشرت سے کٹی رات تو پھر کیا
اور غم میں بسر ہوگئی اوقات تو پھر کیا
جب آئی اجل پھر کوئی ڈھونڈا بھی نہ پایا
قصوں میں رہی حرف و حکایات تو پھر کیا
حد بوس و کنار اور جو تھا اس کے سوا آہ
گر وہ بھی میسر ہوا ہیہات تو پھر کیا
دو دن اگر ان آنکھوں نے دنیا میں میری جان
کی ناز و اداؤں کی اشارات تو پھر کیا
پھر اڑ گئی اک آن میں سب حشمت و شان
لے شرق سے تاغرب لگا ہات تو پھر کیا

آخری دو شعر ہیں

اس نے کوئی دم بیٹھ کے آرام سے کھایا
وہ مانگتا در در پھرا خیرات تو پھر کیا

دولت ھی کا ملنا ھے بڑی چیز نظیر آہ
بالفرض ھوئی اس سے ملاقات تو پھر کیا

یہ اور اس طرح کی کئی اور غزلیں ان دونوں دیوانوں میں موجود ھیں نظیر کی اس طرح کی جو نظمیں اس سے پہلے نظر سے گزریں یہاں انہیں کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ھے - اس میں توکل اور راضی برضا رھنے کا جو فلسفہ اور اسکی تلقین ھے وہ اس طرح کی بے حسی اور بے عملی کے دور کی پیداوار ھے جب عام طور پر لوگ ذھنی اور جسمانی طور پر مفلوج ھو کر رہ گئے تھے اور اپنے آلام اور مصائب کا حل تلاش کرنے کی بجائے یا اپنے مسائل کو مردانہ وار حل کرنے کی جگہ زندگی سے فرار حاصل کرنا چاھتے تھے اور اسے میدان عمل سمجھنے کی جگہ ''جائے عبرت'' کہہ کر تسکین حاصل کرنا چاھتے تھے ، غزلوں میں بعض اور اشعار دیکھئے -

نظیر ھم کو آگے ھوس تھی کفن کی ــــ جو سوچا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا
تن مردہ کو کیا تکلف سے رکھنا ــــ گیا وہ تو جس سے مزین یہ تن تھا
کئی بار ھم نے یہ دیکھا ھے جن کا ــــ مشیّن کفن تھا ، معطر بدن تھا
جو قبر کہن انکی اکھڑی تو دیکھا ــــ نہ عضو بدن تھا نہ تار کفن تھا
نہ گل اپنا نہ خار اپنا نہ ظالم باغباں اپنا ــــ بنایا آہ کس گلشن میں ھم نے آشیاں اپنا

ایک غزل مسلسل ھے

یہ جواھر خانہ دنیا جو ھے با آب وتاب
اھل صورت کا ھے دریا اھل معنی کا سراب

پھر اس جواھر خانہ دنیا کی مختلف رونقوں کا ذکر تفصیل سے الگ الگ کرکے لکھتے ھیں

خواب کہئے اس تماشے کو نظیر اب یا خیال
کچھ کہا جاتا نہیں و اللہ اعلم بالصواب

ایک اور غزل ھے

بحر ھستی میں صحبت احباب ــــ یوں ھے جیسے بروئے آب حباب
گردش آسماں میں ھم کیا ھیں ــــ پر کاھے سیانۂ گرداب

بادہ ناب کیا ہے خون جگر زردی رنگ ہے شب مہتاب
جس کو رقص وسرود کہتے ہیں وہ بھی ہے اک ہوائے خانہ خراب
عمر کہتے ہیں جسکو وہ کیا ہے مثل تحریر موج نقش بر آب

فرصت عمر قطرۂ شبنم
وصل محبوب گوہر نایاب

گزرے دو دم نہ خوشی سے کبھی اے وائے نصیب
تھی عجب کاک وہ جس سے سرے لکھوائے نصیب
اے یار تو جاتا ہے چمن میں تو خبردار
جلدی سے نکل آئیو کر کے نظرے چند
واں آج تو البتہ مہیا ہیں ہر سو
داؤدی و نسرین و گل و برگ و برے چند
کل برگ خزاں دیدہ نظیر اس میں اڑینگے
اور ہونگے پڑے بلبل و قمری کے پرے چند
کیا کاسۂ سے لیجئے اس بزم میں اے ہم نشین
دور فلک سے کیا خبر پہنچے گا لب تک یا نہیں

یہ اور اس طرح کے بہت سے اشعار ایک بڑی غم رسیدہ اور ستم دیدہ طبیعت کی نشان دہی کرتے ہیں یہ سچ ہے کہ غزل میں بھی کہیں کہیں نظیر جولانی طبع دکھانے لگتے ہیں لیکن ان کے قہقہوں میں بھی ان کے غم دل کی داستان سنائی دیتی ہے ۔ نظیر کے یہاں یہ غم محض رسمی نہیں ہے ۔ نہ محض غم جاناں ہے یہ اس غم دوراں کی حکایت ہے جس میں اس دور کے سارے شاعر نوحہ خواں نظر آتے ہیں اور پھر اس نوحہ خوانی میں نظیر کی اپنی تنگدستی ، پریشان حالی اور افلاس نے اور بھی اضافہ کر دیا ہے ۔

اپنی غزل میں اپنے قلم سے اپنا نقشہ یوں کھینچا ہے ۔

کہتے ہیں جسکو نظیر سنئے ٹک اسکا بیاں
تھا وہ معلم غریب ، بزدل وتر سندہ جاں

کوئی کتاب اس کے تئیں صاف نہ تھی درس کی
آئے تو معنی کبھے ورنہ پڑھائی رواں
فہم نہ تھا علم سے کچھ عربی کے آسے
فارسی میں ہاں مگر سمجھے تھا کچھ این وآں
لکھنے کی یہ طرز تھی ، کچھ جو لکھے تھا کبھی
پختگی و خامی کے اس کا تھا خط درمیاں
شعر و غزل کے سوا شوق نہ تھا کچھ آسے
اپنے اسی شغل میں رہتا تھا خوش ہر زماں
سست روش ، پست قد ، سانولا ، ہندی نژاد
تن بھی کچھ ایسا ہی تھا قد کے موافق عیاں
ماتھے پہ اک خال تھا چھوٹا سا مسّے کے طور
تھا وہ پڑا آن کر ابروؤں کے درمیاں
وضع سبک اس کی تھی، تس پہ نہ رکھتا تھا ریش
موچھیں تھیں اور کانوں پر پٹے بھی تھے پنبہ ساں
پیری میں جیسی کہ تھی اسکو دل افسردگی
ویسی ہی رہے تھی ان دنوں جن دنوں میں تھا جواں
جتنے غرض کام ہیں پڑھانے کے سوا
چاہے کچھ اس سے ہوں اتنی لیاقت کہاں
فضل نے اللہ کے اس کو دیا عمر بھر
عزت و حرمت کے ساتھ پارچہ و آب و ناں

شاعری کے ایسے دور میں جب میر جیسے درویش منش شاعر کے تیور یہ تھے کہ

سارے عالم پر ھوں میں چھایا ھوا　　مستند ھے میرا فرمایا ھوا

اور شاعرانہ تعلی کی مثالیں غزل اور قصیدہ میں بہت عام تھیں نظیر کی یہ کسر نفسی ، شان توکل درویشی اور مسکینی ایک عجب تضاد دکھاتی ھے - پھر اس میں حقیقت نگاری کا ایک ایسا انداز پایا جاتا ھے جو اس دور

اور خاص کر غزل میں بہت کم ملتا ہے ، غزلوں کے کچھ اور متفرق اشعار دیکھئے ۔

چمک جا پھر خدا کے واسطے اب طور کے شعلے
کہ مثل آتش افسردہ پھر کچھ دل جلا گھلا

ملوجو ہم سے تو مل لو کہ ہم بہ نوک گیاہ
مثال قطرہ شبنم رہے رہے نہ رہے

چراغ صبح یہ کہتا ہے آفتاب کو دیکھ
یہ بزم تم کو مبارک ہو ہم تو چلتے ہیں

عشق میں عقل و ہوش کھونا تھا ،
کیجے کیا ، اب ہوا جو ہونا تھا

آگئے جب صیاد کے بس میں سوچ کے پھر حاصل کیا
اب تو اسی کی ٹھہری مرضی جس نے اسیر دام کیا

شام کی صبح ہوگئی دم میں
یہ تو کچھ ہم نے خواب سا دیکھا

ابھی تازہ حلقہ زلف میں جو پھنسا ہے طائر دل بھلا
اسیے رنج پہنچے ہے اے صبا تو گھڑی گھڑی نہ ہلا قفس

نہ اس کے نام سے واقف ، نہ اس کی جا معلوم
ملے گا دیکھئے کیونکر وہ بت خدا معلوم

تجھ سا تو کوئی حسن میں یاں نازنیں نہیں
یوں نازنیں بہت ہیں پہ ناز آفریں نہیں

یہ اشعار نظیر کے ناقدین نے ان کی غزلوں میں سے منتخب کئے ہیں لیکن ان کے علاوہ کلام میں ایسے بیشمار اشعار ہیں جو کہیں شاعرانہ مصوری کے اعتبار سے ، کہیں جذبہ اور کیفیت کے اظہار میں ، کہیں موسیقی ترنم اور صوتی اثر کے باعث ، کہیں تشبیہوں اور استعاروں کی بدولت اردو غزل کے بہترین اشعار میں شامل کئے جاسکتے ہیں ۔

درخت بھیگے ھیں گل کے مینہ سے چمن میں بھرا ھے پانی
جو سیر کیجئے تو آج صاحب عجب طرح کا ھے باغ ٹھنڈا

تیرے بھی منہ کی روشنی ، رات گئی تھی مہ سے مل
تاب سے تاب ، رخ سے رخ ، نور سے نور ، ظل سے ظل

یوسف مصر سے مگر ملتے ھیں سب تیرے نشان
زلف سے زلف ، لب سے لب ، چشم سے چشم ، تل سے تل

هجوم آہ پہلے آنکھوں سے اشک ڈھلتے ھیں
بھرے ھیں چاؤ جو دل میں سو یوں نکلتے ھیں

چراغ صبح یہ کہتا ھے آفتاب کو دیکھ
یہ بزم تم کو مبارک ھو ھم تو چلتے ھیں

گو آتش گل بھڑکی ھے پر یہ نہیں توفیق
پھونکے جو اسیران چمن کے قفسوں کو *

مجبور ھو ھم اس کی یوں انجمن سے نکلے
جیسے قفس میں پڑ کر بلبل چمن سے نکلے

سحر نگہ کے ھمرہ پہلو سے یوں چلا دل
جیسے کوئی ھو بے بس اپنے وطن سے نکلے

نہ سرخی غنچۂ گل میں ترے دھن کی سی
نہ یاسمن میں صفائی ترے بدن کی سی

گلوں کے رنگ کو کیا دیکھتے ھو اے خوبان
یہ رنگتیں ھیں تمہارے ھی پیرھن کی سی†

بلا شبہ ان غزلوں میں تغزل کی پوری شان پائی جاتی ھے اور بعض ناقدین کا یہ خیال کسی حد تک محل نظر ھے کہ نظیر کی غزلیں تغزل سے

---

* اس شعر پر سے ایمائیت کا پردہ اٹھا کر دیکھئے تو شاید اردو غزل میں ایسے اشعار بہت مشکل سے ملینگے

† فیض کا یہ شعر دیکھئے -

رنگ پیراھن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ھے تمہارے بام پر آنے کا نام

محروم ہیں لیکن نظیر کی نظموں اور غزلوں کا مقابلہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بحیثیت مجموعی ان کی طبعی افتاد نظموں کی طرف ہے یہی وجہ ہے ان غزلوں میں کوئی ایسا رنگ نہیں ہے جسے خاص طور پر نظیر کا رنگ کہہ سکیں سوائے اس کے کہ کہیں کہیں غزلوں میں نظموں کا سا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ یا کہیں کہیں ان کی شوخی اور ظرافت نے یہاں بھی وہی سماں باندھ دیا ہے جو نظیر کی نظموں میں پایا جاتا ہے لیکن نظموں میں نظیر کی طبیعت جس طرح کھلتی ہے وہ ان غزلوں میں کچھ رکی رکی سی نظر آتی ہے اس کا ایک سبب یہ ہے کہ نظیر اپنی نظموں میں تفصیل اور جزئیات نگاری سے کام لیتے ہیں۔ واقعہ نگاری پر زور دیتے ہیں اور نظم کے کسی مروجہ معیار یا طریقہ راسخہ شعرا کے پابند نہیں، غزل کا انداز الگ ہوتا ہے، ان میں تفصیل اور جزئیات نگاری کی جگہ صرف اشاروں اور کنایوں سے کام لیا جاتا ہے اور جزئیات کا تجزیہ کرنے کی بجائے اجمال کی ضرورت ہوتی ہے نظم کی بنیاد بڑی حد تک مطالعہ اور مشاہدہ اور اس کے بیان پر ہوتی ہے غزل کی اساس ' احساس ' پر ہے۔ اس لئے نظم گو شاعر اپنے گرد و پیش کے ماحول کا جائزہ لیتا ہے، غزلگو اپنی کیفیات اور جذبات کا جائزہ لینے کے لئے اپنے دل کی کائنات کی سیر کرتا ہے۔ اسے برسوں یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس کے کمرے کی کھڑکی کے نیچے پائیں باغ بھی ہے اور اس میں پھول بھی کھلتے ہیں، وہ اپنے دل کے داغوں کی بہار دیکھتا اور دکھاتا ہے اسی لئے غزل میں ایک خاص طرح کی داخلیت پیدا ہو جاتی ہے، اس کے لئے گوشہ نشینی اور تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ غزل جب درباروں اور مشاعروں میں پہنچی تو اس میں تغزل کے عناصر کم ہوتے گئے جس کی انتہا لکھنو پہنچ کر ناسخ اور آتش کے دور میں ملتی ہے، نظم گو شاعر کے لئے یہ گوشہ نشینی بڑی محرومی ہے۔ اسے خلوت سے نکل کر انجمن میں آنا پڑتا ہے نظیر بجائے خود ایک انجمن تھے، پھر کوئی میلہ ٹھیلہ، جلسہ جلوس، کوئی تہوار اور تقریب ایسی نہ تھی جس میں وہ شرکت نہ کرتے ہوں اور یہ شرکت محض تماشائی کی حیثیت سے نہیں ہوتی تھی، وہ خود ان تمام

دلچسپیوں اور تفریحوں میں حصہ لیتے تھے ، یہی وجہ ہے کہ ان کی اس طرح کی نظموں میں بڑی اصلیت اور واقعیت پائی جاتی ہے اور اسی باعث انھیں اپنی شاعری میں ایک ایسی دنیا کی ترجمانی کا موقع ملا جہاں اُن کے معاصرین غزلگو پہنچنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے ، نظیر کو اس بدعت کی سزا یہ ملی کہ انھیں '' ثقہ '' شاعروں کی محفل سے خارج کردیا گیا لیکن اردو کو ایسا نظم گو شاعر ملا جس کی مثال اس دور میں کہیں اور نہیں ملتی ۔

زبان و بیان

آتش کے اس مقولہ کو اب تک بڑی شہرت ہوچکی ہے کہ شاعری بھی مرصع کار کا کام ہے اور الفاظ کی بندش نگینوں کے جڑنے سے کسی طرح کم نہیں' آتش نے اس بات کو بہت دور تک پہنچا دیا ہے اور یہ سچ ہے کہ آن کے زمانے میں آردو شاعری اور خاص طور پر لکھنوی شاعری الفاظ کی صنعت گری بن کر رہ گئی تھی، یہ ایسی شاعری تھی جو اپنی تراش خراش' پیراھن ظاھری آرائش اور لوازمات کے اعتبار سے حسن کاری کا ایک نادر نمونہ بن گئی تھی لیکن اس کا پیکر زندگی کی حرارت اور جذبات کی توانائی سے محروم تھا ایسی شاعری لفظی صناعی کا نادر نمونہ تو ہوسکتی ہے اور اس کی ایک لسانی اور تاریخی حیثیت بھی مسلم ہے لیکن جذبات اور واقعات' کیفیات اور احساسات سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور یہی وہ سر چشمے ہیں جن سے شاعری کا چمن شاداب ہوتا ہے ممکن ہے بعض خاص حالات اور سماجی تقاضوں سے کسی زمانے میں (جیسا کہ لکھنؤ کے نوابی عہد میں ہوا) شاعری کا یہ مذاق ہی عام طور پر شاعری کے معیار کو متعین کرتا ہو لیکن حالات کے بدلتے ہی اس قدر کا بدلنا بھی ضروری ہے چنانچہ خود لکھنؤ میں جب اس لفظی صنعت گری کے خلاف رد عمل شروع ہوا تو لکھنوی شاعر مرزا غالب اور میر کو اپنا رہبر اور رہنما بنانے پر مجبور ہوئے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی شاعری میں الفاظ کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا' آخر الفاظ ہی کے وسیلے سے شاعر کے خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر یہ وسیلہ ناقص ہے تو خیالات یا جذبات کتنے ہی عمدہ

هوں وہ اعلیٰ درجے کی شاعری کا پیکر اختیار نہیں کرسکتے' مولانا حالی لکھتے ہیں :-

''کائنات کے مطالعہ کی عادت ڈالنے کے بعد دوسرا نہایت ضروری مطالعہ یا تفحص ان الفاظ کا ہے جن کے ذریعہ سے مخاطب کو اپنے خیالات مخاطب کے روبرو پیش کرتے ہیں۔ یہ دوسرا مطالعہ بھی ویسا ہی ضروری اور اہم ہے جیسا کہ پہلا' شعر کی ترتیب سے وقت اول متناسب الفاظ کا انتخاب کرنا اور پھر ان کو ایسے طور پر ترتیب دینا کہ شعر سے معنی مقصود کے سمجھنے میں مخاطب کو کچھ تردد باقی نہ رہے اور خیال کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور باوجود اس کے اس ترتیب میں ایک جادو مخفی ہو جو مخاطب کو مسخر کرے' اس مرحلہ کا طے کرنا جس قدر دشوار ہے اسی قدر ضروری بھی ہے کیونکہ اگر شعر میں یہ بات نہیں ہے تو اس کے کہنے سے نہ کہنا بہتر ہے' اگرچہ شاعر کے تخیلہ کو الفاظ کی ترتیب میں بھی ویسا ہی دخل ہے جیسا کہ خیالات کی ترتیب میں لیکن اگر شاعر زبان کے ضروری حصے پر حاوی نہیں ہے اور ترتیب شعر کے وقت صبر و استقلال کے ساتھ الفاظ کا تتبع اور تفحص نہیں کرتا تو محض قوت متخیلہ کچھ کام نہیں آسکتی'' حالی اس بحث کو خاص طول دیتے ہیں اور اُن منازل و مراحل کا تجزیہ کرتے ہیں جن سے شاعر تخلیق شعر کے وقت گزرتا ہے' کس طرح وہ ایک ہی خیال یا ایک ہی بات کے ظاہر کرنے کے لئے مختلف الفاظ' تراکیب' تشبیہات' استعارے اور تمثیلیں اختیار کرتا ہے اور بار بار اُن پر غور کرتا ہے۔ شعر موزوں ہوجاتا ہے۔ ردیف قافیہ' وزن سب درست ہوتا ہے لیکن اسے اس وقت تک اطمینان حاصل نہیں ہوتا جب تک اس کے خیالات اس کے منتخب الفاظ میں روشن آئینہ کی طرح پوری طرح نہیں چمکنے لگے' وہ بار بار نظرثانی کرتا ہے' الفاظ

بدلتا ہے' ان کی ترکیب و ترتیب بدلتا ہے ' کبھی مصرعے کے مصرعے کاٹ ڈالتا ہے اور پھر بھی شعر ناقص رہے تو شعر کو ہی قلمزد کردیتا ہے ، یہ بات صرف اوسط درجے کے شاعروں کی نہیں' اعلی درجے کے جو شاعر ہیں انہوں نے بھی بار بار اپنے کلام کی خود اس طرح اصلاح کی ہے -

اس اعتبار سے نظیر اکبر آبادی کا کلام اردو شاعری کی تاریخ میں ایک منفرد حیثیت کا مالک ہے - کہا جاتا ہے کہ اردو کے دو شاعر ایسے ہیں جنہوں نے اپنی شاعری میں سب سے زیادہ ذخیرہ الفاظ سے فائدہ اٹھایا ہے ایک میر انیس اور دوسرے نظیر اکبر آبادی ' لیکن میر انیس کی شاعری کا محور اور مرکز مرثیہ ہے ' یہ سچ ہے کہ انہوں نے مرثیہ کے میدان میں بڑی وسعت پیدا کی اور بقول سودا " مضمون واحد کو ھزار رنگ سے ربط معنی دیا" لیکن مضمون واحد' کی پابندی بہرحال ایک سنگ گراں بن کر ان کے راستے میں حائل ہے الفاظ کے انتخاب میں انہیں اپنے موضوع کی اهمیت اور عظمت کا احساس رهتا ہے وہ ایک خاص ذهنی سطح سے نیچے اتر کر نہیں آسکتے ' پھر مرثیوں میں 'مرثیت' قائم رکھنے کا احساس بھی اس میں شامل ھوجاتا ہے - وہ اپنے حریف مرزا دبیر کی طرح پر شکوہ تراکیب اور بلند آهنگ الفاظ ثقیل اور نامانوس عربی فارسی کے الفاظ اور اصطلاحات استعمال کرکے مرثیہ کی پوری فضا کو کمزور کرنا نہیں چاہتے اس لئے بھی وہ الفاظ کے ایک محدود اور مخصوص ذخیرے سے استفادہ کرتے ہیں' نظیر اکبرآبادی کا حال ان سے مختلف ہے ' ان کے یہاں کسی ایک مخصوص موضوع یا محدود فضا کا سوال پیدا نہیں ھوتا ' وہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر سے نقاب اٹھاتے ہیں' صوفیانہ اور اخلاقی شاعری بھی ان کے یہاں ہے ' میلوں' ٹھیلوں اور جلسے جلوسوں کی تصویریں بھی' ان کے یہاں شاعری

میں ''طبقات'' کی قید نہیں اور نہ ذخیرہ الفاظ میں وہ طبقہ بندی گوارا کرتے ہیں' بعض نقادوں کو ان کے لب و لہجہ کے عامیانہ پن کی شکایت ہے لیکن نظیر کو اس کی بھی پروا نہیں' انہوں نے زندگی کو اس کے حقیقی اور بھرپور روپ میں دیکھنے کے لئے جہاں موقع ملا ہے اس کے چہرے پر سے نقاب اٹھانے کی کوشش کی ہے اور اس پردہ کے اٹھنے پر انہوں نے جو کچھ دیکھا ہے اسے بلا جھجک اور بے تکلف فوراً بیان کردیا ہے' حقیقت کی عریانی کو چھپانے کی انہوں نے کبھی کوشش نہیں کی اس لئے انہیں پر تکلف یا پر تصنع انداز بیان اختیار کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ جیسی صاف اور سادہ ان کی زندگی کی تصویریں ہیں ویسا ہی بے تکلف اور برجستہ ان کا انداز بیان بھی ہے۔

نظیر اکبرآبادی کے ذخیرۂ الفاظ میں شامل ''عامیانہ'' الفاظ کے سلسلے میں ایک اور اہم نکتہ بھی قابل غور ہے، متقدمین نے شاعری کو صرف شرفا کا پیشہ بتایا تھا اور انہیں اس کا بڑا ملال تھا کہ بزازوں اور ندافوں نے شاعری کیوں شروع کردی یہ دوسری بات ہے کہ انہیں کے معاصرین میں تذکرہ نگاروں نے بزازوں اور ندافوں کے ساتھ 'حجام شاعروں' کو بھی اپنے تذکروں میں جگہ دی ہے۔ آخر یہاں مصحفی جب ''حجام پسر'' کی الفت میں سر منڈاکر فارغ البال ہونے پر تیار ہیں اور طفل حجام شاعر کا محبوب بن سکتا ہے تو پھر حجام کا شاعر ہونا کیوں عجیب لگتا ہے لیکن اس کے باوجود انشاؔ تک جو میر کی طرح بہت سخت رکھ رکھاؤ کے قائل نہیں تھے بیچارے عطاروں اور سپاہیوں کو شاعری کا اہل نہیں سمجھتے' معلوم ہوتا ہے کوئی شاعر بیچارہ دال موٹھ بیچ کر گزارہ کرتا تھا۔ انشا اور مصحفی کے معرکے میں وہ بھی زد سے نہ بچا' غرض ان شاعروں نے شاعری کو ایک خاص طبقہ شرفا کی میراث سمجھ لیا تھا اور ظاہر ہے کہ شاعری

کی زبان' اس کے ذخیرہ الفاظ اور لب و لہجہ پر ان کی جاگیرداری کی مہر لگادی تھی' نظیر نے جس طرح اپنی زندگی اور شاعری کے موضوعات سے اس طبقہ شرفا کی اجارہ داری کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح اس نے عوام کی زبان کو شاعری اور ادب کا درجہ دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ زبان ہر قسم کی شاعری اور سارے موضوعات کے لئے مناسب وسیلہ اظہار نہیں بن سکتی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ نظیر نے اس طرح انداز بیان اور وسیلہ اظہار میں بڑی وسعت پیدا کردی ہے۔

اسی سلسلے میں نظیر کی قادرالکلامی کے بارے میں بھی کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے قدیم شعرا کے یہاں قادرالکلامی کا اندازہ مشکل ردیف اور قافیے کی تلاش' عجیب و غریب الفاظ کے انتخاب' علمی اور فنی اصطلاحات کے استعمال سے کیا جاتا تھا ، اس سے بڑھ کر بہت ہوا تو یہ کہ کسی نے آردو کے ساتھ اپنی فارسی دانی کا بھی دعویٰ کردیا۔ یا ھندی' پنجابی الفاظ اور اشعار کے استعمال سے اپنی اھمیت کو ثابت کرنا چاھا۔ چنانچہ سعادت یار خاں رنگین اسی پر فخر کرتے ھیں انہوں نے سلطان ٹیپو کی شان میں سترہ بندوں پر مشتمل ایک قصیدہ لکھا ہے اور ہر بند ایک الگ زبان میں ہے۔ رنگین کا کمال سر آنکھوں پر آردو کے شاعر کی حیثیت سے ان کے فن کا یہ مظاھرہ مداری کا تماشہ معلوم ھوتا ہے جو ایک ھی تھیلے میں سے کائنات کی ہر چیز نکال لاتا ہے۔ نظیر آردو ، فارسی ، عربی ، پنجابی ، ھندی سب پر قادر ھیں لیکن ان کی قادرالکلامی اس سے ثابت نہیں ھوتی بلکہ اس کی اساس ان کے صرف آردو کلام پر قایم ہے انہوں نے غزلیں لکھی ھیں، مثنویاں کہی ھیں، اخلاق نظمیں لکھی ھیں۔ کہانیاں نظم کی ھیں مناظر و مظاھر قدرت بیان کئے ھیں۔ تہواروں اور تقریبات کے

نقشے کھینچے ھیں اور ھر موقع پر نہایت موزوں اور مناسب زبان استعمال کی ھے۔ مضمون کے علاوہ یہ ان کے الفاظ کے سرمائے اور انتخاب کا ھی کرشمہ ھے کہ ان کی ھر نظم میں موضوع کی مناسبت سے ایک مکمل فضا پیدا ھو جاتی ھے۔

اس فضا کے پیدا کرنے میں وہ کبھی کبھی الفاظ کے معنوی پہلو کے علاوہ محض صوتی تاثر سے بھی بڑا کام لیتے ھیں۔ ایک نظم میں انہوں نے یہ خیال ظاھر کیا ھے کہ کائنات میں ھر شے تسبیح خواں ھے۔ یہ مضمون نرالا نہیں لیکن نظم پڑھنے والا معنوں سے قطع نظر صرف اس کے صوتی آھنگ سے بھی بےحد متاثر ھوتا ھے۔ نظیر کے جو شہر آشوب نظم ھوئے ھیں وہ بھی اس کی ایک اچھی مثال ھیں۔ ایک ''مخمس دربیان تماشائے دنیائے دوں'' کا تجزیہ کیجئے۔ اس میں 'ڑ' کی تکرار ھے۔ 'ٹ' کی تکرار ھے۔ یہ تکرار ایک طرح کا آشوب خود صوتی آھنگ سے پیدا کرتی ھے آشنان اور نہانے کے میلے میں جو الفاظ استعمال ھوئے ھیں ان میں دریا کی سی روانی ھے۔ جہاں تلاطم پیدا کرنا ھے وھاں ایسے الفاظ ھیں جو 'پر شور' ھیں جہاں سکون دکھانا ھے وھاں نرم و سبک الفاظ لائے ھیں۔ مہادیو کی شادی کا منظر دیکھئے الفاظ کا صوتی تاثر ایک خوشی اور ولولہ پیدا کرتا ھے۔ اخلاق نظموں میں آدمی نامہ دیکھئے۔ جیسا اس کا مضمون صاف سبدھا اور الم انگیز ھے ویسے ھی الفاظ ھیں۔ صرف اسی ایک پہلو پر نظر رکھیں تو معلوم ھوتا ھے کہ نظیر کو الفاظ کے صوت و آھنگ کے تاثر کا پورا علم ھے یہ بات اگر اردو شاعری میں کہیں اور ایک کمال بن کر ظاھر ھوئی ھے تو وہ صرف میر انیس اور کسی قدر مرزا دبیر کے یہاں ھے یا بعد میں اقبال نے کسی قدر اس کا اظہار کیا ھے ورنہ عام طور پر ھمارے شعراء نے الفاظ کی اس زبردست قوت سے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھایا

ہے' نظیر کے ہاں اس سلسلے کی بعض مثالیں دیکھئے :-

ہولی کا ایک منظر ہے ۔ اس تہوار میں گانا بجانا ایک اہم عنصر ہے ۔ پھر یہ ایک عوامی تہوار ہے ۔ اس کے لئے باقاعدہ کسی مجلس یا محفل کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی' ہولی کے متوالے سڑکوں اور شاہراہوں پر دن بھر ناچتے گاتے پھرتے ہیں گلیوں اور کوچوں میں عبیر اور گلال اڑنے لگتا ہے ساری فضا میں ایک طرب انگیز موسیقی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے' نظیر نے یہ کیفیت ان دو بندوں کے ذریعے سے پیش کی ہے ۔

کچھ طبلے کھٹکے، تال بجے' کچھ ڈھولک اور مردنگ بجے
کچھ جھڑیں بین ربابوں کی' کچھ سارنگی اور چنگ بجے
کچھ تار طنبوروں کے جھنکے کچھ ڈھمڈھمی اور مرچنگ بجے
کچھ گھنگرو کھٹکے جھم جھم جھم کچھ گت گت پر آہنگ بجے
ہے ہر دم ناچنے گانے کا یہ تار بندھایا ہولی نے

یہاں الفاظ میں ایک جھنکار پائی جاتی ہے ۔ موسیقی نرم و نازک اور سکون بخش بھی ہوسکتی ہے ۔ اور اس میں ہمہمہ اور جھنکار بھی پائی جاسکتی ہے ۔ شادی کے وقت کی شہنائی اور میدان جنگ کے طبل و نقارے کی موسیقی الگ الگ ہوتی ہے ۔ ہولی کی مناسبت سے یہاں جو صوتی تاثر پیدا ہونا چاہئے تھا وہ مردنگ، چنگ، مرچنگ، آہنگ بطور قوافی استعمال کرکے پورا کردیا ہے ۔ رقص کی تال سے ملا کر دیکھئے تو اس موسیقی اور تال میں بھی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے ۔ دوسرا بند یہ ہے ۔

ہر جا گہ تھال گلالوں سے خوش رنگت کی گلکاری ہے
اور ڈھیر عبیرون کے لاگے' سو عشرت کی تیاری ہے
ہیں راگ بہاریں دکھلاتے اور رنگ بھری پچکاری ہے

منھ سرخی سے گلنار ہوئے تن کیسر کی سی کیاری ہے
یہ روپ چمکتا دکھلایا، یہ رنگ دکھایا ہولی نے

قطع نظر اس سے کہ نظیر نے بند کے چوتھے مصرعے میں جیسی جاندار تصویر کھینچ دی ہے اس پورے بند میں بھی رقص و حرکت اور طرب انگیز موسیقیت پائی جاتی ہے۔

بستی تاج گنج کے تیراکی کے میلے کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں ایسے الفاظ منتخب کئے ہیں جن میں دریا کی روانی، موجوں کا زیر و بم، دھارے کی تیزی سب کچھ آگئی ہے۔ مہا دیو جی کی برات کے سلسلے میں براتی بھی عجیب و غریب تھے۔ ان کا حال صرف آٹھ مصرعوں میں ہے لیکن یہاں بھی الفاظ کے آہنگ نے ایک پر عظمت ہیبت طاری کردی ہے۔ غرض ان کی کوئی نظم ایسی نہیں جس میں الفاظ کے انتخاب میں نظیر نے اپنا خاص رنگ قائم نہ رکھا ہو۔

لیکن یہ بات ان کی غزلوں کی زبان کے بارے میں پوری طرح درست نہیں اور یہ بات صرف ان کی غزل کی زبان ہی نہیں مضمون کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ نظیر روایت پرست نہیں روایت شکن تھے، لیکن غزل کے بت کو توڑنا ان کے بس کی بات نہ تھی، یہ روایت جسے فارسی کے غزل گو شعراء نے اپنی برسوں کی کوششوں اور کاوشوں سے پروان چڑھایا تھا اور جسے ریختہ گو شعراء نے شباب بخشا تھا نظیر اپنی طبیعت میں بغاوت کے باوجود یہاں ''سرگشتہ خمار رسوم و قیود'' نظر آتے ہیں، اردو میں سلطان محمد قلی قطب سے لے کر میر تک غزل کی جو روایت قائم ہوتی تھی اس میں غزل کے موضوعات ہی نہیں اس کی زبان کی بھی ایک ادا بن گئی تھی، اس سے انحراف گویا غزل سے انحراف تھا، ممکن ہے جس طرح مرزا غالب کو انہیں اسباب کی

بنا پر ''ظرف تنگنائے غزل'' سے گھبرا کر وسعت کی تلاش ہوئی تھی اسی وحشت نے نظیر کو غزل چھوڑ کر نظم کی طرف مائل کیا۔ نظم کی اس وقت تک کوئی مسلسل یا مربوط روایت قائم نہیں ہوئی تھی اس لئے نظیر کو مضمون اور زبان دونوں میں آزادی سے پرواز کا موقع ملا ۔ جہاں انہوں نے اپنے شوق سے یا ضرورتاً یا رواج زمانہ سے مجبور ہوکر غزل سرائی کی وہاں غزل کی زبان ان کی دامن گیر ہوئی ۔

نظیر کے عام اسلوب بیان کے بارے میں کئی باتیں اشارتاً پہلے کی جا چکی ہیں کسی شاعر ادیب یا فنکار کا اسلوب یا اسٹائل اس کی شخصیت اور کردار کا بھرپور ترجمان ہوتا ہے ۔ شاعر جب تک اپنے فن میں اپنی شخصیت کو بالکل سمو نہیں دیتا اس نخل کا شاداب ہونا ممکن نہیں ہوتا' اس نخل کی نس نس میں اس کا لہو گردش کرتا ہے اور اس کے ہر پھول کی سرخی اس کے خون جگر کی مرہون منت ہوتی ہے ۔ جس طرح کسی خاص موضوع کا انتخاب شاعر اور فنکار کے کردار' اس کی افتاد طبع اور شخصیت کی غمازی کرتا ہے اسی طرح اس کے الفاظ کا انتخاب و استعمال بھی اس انفرادیت کا ترجمان ہوتا ہے۔ انشاؔ نے اپنی دریائے لطافت میں دلی کے مختلف گلی کوچوں میں مختلف طبقات کے نمائندوں کی گفتگو اور محاورے کے جو مختلف نمونے دکھائے ہیں ان میں اس کا کسی قدر اندازہ ہوسکتا ہے شاعری اور ادب کی زبان بیشک ایک حد تک معیاری (Standardized) ہو جاتی ہے اور اس میں انفرادیت کے اظہار کا موقع کم ہی رہ جاتا ہے لیکن ہر شاعر جو واقعی تخلیق شعر پر قادر ہوتا ہے اسے الفاظ کا جامہ اپنے خیالات پر تنگ نظر آتا ہے۔ مرزا غالب ہوں یا اقبال یہ تنگی کا احساس اور اسے وسعت دینے کی کوشش سب کے یہاں پائی جاتی ہے اسی سے شخصیت اور کردار کے منفرد پہلو اجاگر ہوتے ہیں ۔

نظیر کی شخصیت کا سب سے بڑا اور اہم پہلو ان کا عوامی کردار ہے۔ وہ اپنے میر صاحب یا مرزا صاحب ہونے پر فخر نہیں کرتے نہ انہیں فلاں ابن فلاں ہونے پر ناز ہے۔ نہ وہ کسی شاہ کے مصاحب بن کر اتراتے پھرتے ہیں۔ وہ بیچارے ایک غریب مدرس ہیں جو روزانہ ٹٹو پر بیٹھ کر بستی تاج محل سے آگرہ تک لڑکوں کو پڑھانے جاتے ہیں۔ یہ ان کی زندگی کا کاروباری پہلو ہوا۔ تفریحی پہلو یہ تھا کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق صرف عوامی میلوں ٹھیلوں، تہواروں اور تقریبوں میں شریک ہو سکتے تھے۔ اس لئے آن کے یہاں نہ تو وہ شخصیت ہے جو "سو پشت سے ہے پیشۂ آباسپاہ گری" ہونے پر فخر کرے۔ نہ وہ جسے اپنی سعادت پر ناز ہو، نہ وہ جو ملک الشعرا ہو نہ وہ جسے دیدہ ور یا دانائے راز ہونے کا دعویٰ ہو۔ وہ ایک عام انسان اور عوامی کردار کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں اور یہی شخصیت ان کے اسٹائل یا اسلوب کی بنیاد قرار پاتی ہے۔

چونکہ یہ شخصیت ایک سچی اور اصلی شخصیت ہے جو نہ خود کسی فریب میں مبتلا ہے اور نہ کسی دوسرے کو فریب میں مبتلا کرتی ہے اس لئے بہت معمولی سطح پر ہونے کے باوجود یہ ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہاں تکلف اور تصنع کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ تعلی، دعوے اور علم و فضل کے غرور کے حجابات چاک ہو جاتے ہیں۔ جس طرح نظیر کی شخصیت ہم میں گھل مل جاتی ہے اسی طرح ان کا اسلوب بھی ہمارے دل پر اثر کرتا ہے، یہ وہ اسلوب ہے جسے ہم عام انسان کا اسلوب (Style of the common man) کہہ سکتے ہیں اور اسی لئے ایسے اسلوب کے مقابلے میں جس کا حلقہ اثر محدود و مخصوص ہو اس کی ہمہ گیری مسلم ہے۔

یہ بحث بالکل الگ ہے کہ نظیر کے اس اسلوب کو عظیم (great style) یا ارفع (sublime) کہہ سکتے ہیں یا نہیں - عظمت اور رفعت کے تصورات بنیادی نہیں اضافی ہیں -

جو لوگ عظمت کے ساتھ ایک ذہنی بلندی اور جذباتی ترفع کا تصور وابستہ کرتے ہیں اُن کے لئے نظیر کی شاعری اپنے موضوعات اور اسالیب دونوں کے اعتبار سے ایک بڑی پست سطح رکھتی ہے۔ وہ نظیر کا مقابلہ غالب یا اقبال سے کرتے ہیں اور ان کے لئے نظیر کو اس سطح تک لے جانا نا ممکن ہو جاتا ہے۔ اور نظیر بلاشبہ عظمت اور رفعت سے محروم نظر آتے ہیں لیکن جو لوگ شاعری کا مقصد زندگی کی بھرپور ترجمانی سمجھتے ہیں اور شاعر جن کے لئے اپنے تخیل کی دنیا نہیں بلکہ گردوپیش کے حالات اور واقعات سے ہی خام مواد لے کر نئے پیکر تراشتا ہے وہ اسی کو سب سے بڑا آذر سمجھتے ہیں، جہاں شاعر کی آواز اُن کے دل کی آواز اور مغنی کا نفس ان کے نفس سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے وہی ان کے نزدیک شاعر اور مغنی کی معراج ہے۔ اور آج بھی ہزاروں پڑھنے اور سننے والوں کے لئے نظیر کو یہ معراج حاصل ہے :-

انتخاب کلام

شہر آشوب

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے اختیار بند
رہتی ہے طبع سوچ میں لیل و نہار بند
دریا سخن کی فکر ہے موجدار بند
ہو کس طرح نہ منہ میں زباں بار بار بند
جب آگرے کی خلق کا ہو روزگار بند

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی
کوٹھے کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی
ہر گھر میں اس طرح سے بھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جوں ایک بار بند

دمڑا نہ کوٹھری بیچ نہ تھیلی میں زر رہا
خطرہ نہ چور کا نہ اچکے کا ڈر رہا
رہنے کو بن کواڑ کا پھوٹا کھنڈر رہا
دھنکار جاگنے کا نہ مطلق اثر رہا
آنے سے بھی جو ہو گئے چور و چکار بند

صراف، بنیے، جوہری اور سیٹھ، ساہوکار
دیتے تھے سب کو نقد، سو کھاتے ہیں اب ادھار
بازار میں اڑے ہے پڑی خاک بے شمار
بیٹھے ہیں یوں دکانوں میں اپنے دکان دار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

سوداگروں کو سود نہ بیوپاری کو فلاح
بزاز کو ہے نفع نہ پنساری کو فلاح
دلال کو ہے بافت نہ بازاری کو فلاح
دکھیا کو فائدہ نہ پسنہاری کو فلاح
یاں تک ہوا ہے آن کے لوگوں کا کار بند

لوٹیں ہیں گرد پیش جو قزاق راہ مار
بیوپاری آتے جاتے نہیں ڈرسے زینہار
کوتوال رووین خاک آڑاتے ہیں چوکیدار
ملاحوں کا بھی کام نہیں چلتا میرے یار
ناویں ہیں گھاٹ گھاٹ کی سب وار پار بند

بیچیں تھے وہ جو گوندھکے پھولوں کی بدھی ہار
مرجھا رہی ہے دل کی کلی جی ہے داغدار
جب آدھی رات تک نہ بکی جنس آبدار
لاچار پھر وہ ٹوکری اپنی زمیں پہ مار
جاتے ہیں گر دکان کو آخر وہ ہار بند

ڈیرو بجا کے وہ جو آتارے ہیں زہر مار
آپ ہی وہ کھیلتے ہیں ہلا سر زمیں پہ مار
منتر تو جب چلے کہ جو ہو پیٹ کا آدھار
جب مفلسی کا سانپ ہو آن کے گلے کا ہار
کیا خاک پھر وہ باندھیں کہیں جاکے مار بند

لذت ہے جن کو حسن کے نقش و نگار سے
محبوب ہیں جو غنچہ دھن گل عذار سے
آویں اگر وہ لاکھ طرح کی بہار سے
کوئی نہ دیکھے آن کو نظر بھر کے پیار سے
ایسے دلوں کے ہوگئے آپس میں کار بند

پھرتے ہیں نوکری کو جو بن کر رسال دار
گھوڑے کی ہے لگام نہ اونٹوں کی ہے مہار
کپڑا نہ لتا پال نہ پرتل نہ بوجھ بھار
یوں ہر مکاں میں آکے آترتے ہیں سوگوار
جنگل میں جیسے دیتے ہیں لاکر آتار بند

محنت سے ہاتھ پاؤں کی کوڑی نہ ہاتھ آئے
بیکار کب تلک کوئی قرض و آدھار کھائے ؟

دیکھوں جسے وہ کرتا ہے رو رو کے ہائے ہائے
آتا ہے ایسے حال پہ رونا ہمیں تو ہائے
دشمن کا بھی خدا نہ کرے کاروبار بند

اس شہر کے فقیر بھکاری جو ہیں تباہ
جس گھر میں جاسوال وہ کرتے ہیں خواہ مخواہ
بھوکے ہیں کچھ بھجائیو بابا خدا کی راہ
واں سے صدا یہ آتی ہے ''پھر مانگو'' جب تو آہ
کرتے ہیں ہونٹھ اپنے وہ ہو شرمسار بند

کیا چھوٹے کام والے و کیا پیشہ‌ور نجیب
روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب
ہوتی ہے بیٹھے بیٹھے جب آ شام عنقریب
اُٹھتے ہیں سب دکان سے کہہ کر کہ یا نصیب!
قسمت ہماری ہوگئی بے اختیار بند

قسمت سے چار پیسے جنہیں ہاتھ آتے ہیں
البتہ روکھی سوکھی وہ روٹی پکاتے ہیں
جو خالی آتے ہیں وہ قرض لیتے جاتے ہیں
یوں بھی نہ پایا کچھ تو فقط غم ہی کھاتے ہیں
سوئے ہیں کر کواڑ کو اک آہ مار بند

ہیں باغ جتنے یاں کے سو ایسے پڑے ہیں خوار
کانٹے کا ان میں نام نہیں پھول در کنار
سوکھے ہوئے کھڑے ہیں درختاں میوہ دار
کیاری میں خاک دھول روش پر پڑے غبار
ایسی خزاں کے ہاتھوں ہوئی بہار بند

دیکھے کوئی چمن تو پڑا ہے اُجاڑ سا
غنچہ نہ پھل نہ پھول نہ سبزا ہرا بھرا
آواز قمریوں کی نہ بلبل کی ہے صدا
نہ حوض میں ہے آب نہ پانی ہے نہر کا
چادر پڑی ہے خشک تو ہے آبشار بند

بے وارثی سے آگرہ ایسا ہوا تباہ
پھوٹی حویلیاں ہیں تو ٹوٹی شہر پناہ
ہوتا ہے باغباں سے ہر اک باغ کا نباہ
وہ باغ کس طرح نہ لٹے اور نہ اجڑے آہ
جس کا نہ باغباں ہو نہ مالک نہ خار بند

کیوں یارو اس مکاں میں یہ کیسی چلی ہوا ؟
جو مفلسی سے ہوش کسی کا نہیں بجا
جو ہے سو اس ہوا میں دوانہ سا ہو رہا
سودا ہوا مزاج زمانے کو یا خدا
تو ہے حکیم کھول دے اب اس کے چار بند

****
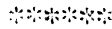
آٹا دال

آٹے کے واسطے ہے ہوس ملک و مال کی
آٹا جو پالکی ہے تو ہے دال نالکی
آٹے ہی دال سے ہے درستی یہ حال کی
اس سے ہی سب کی خوبی ہے جو حال و قال کی
سب چھوڑو بات طوطی و پدڑی و لال کی
یارو کچھ اپنی فکر کرو آٹے دال کی

اس آٹے دال ہی کا جو عالم میں ہے ظہور
اس سے ہی منہ پہ نور ہے اور پیٹ کو سرور
اس سے ہی آکے چڑھتا ہے چہرے پہ سب کے نور
شاہ و گدا اسی کے ہیں سب مزدور
سب چھوڑو بات طوطی و پدڑی و لال کی
یارو کچھ اپنی فکر کرو آٹے دال کی

قمری نے کیا ہوا جو کہا حق سرہ
اور فاختہ بھی بیٹھ کے کہتی ہے قہقہو
وہ کھیل کھیلو جس سے ہو تم جگ میں سرخرو
سنتے ہو اے عزیزو اسی سے ہے آبرو
سب چھوڑو بات طوطی و پدڑی و لال کی
یارو کچھ اپنی فکر کرو آٹے ڈال کی

مینا کے پالنے کی اگر دل میں میل ہے
سچ پوچھئے تو یہ بھی خرابی کے ذیل ہے
سب عشق بازی روزی کے ہوتی طفیل ہے
روزی نہ ہو تو مینا بھی پھر کیا چڑیل ہے
سب چھوڑو بات طوطی و پدڑی و لال کی
یارو کچھ اپنی فکر کرو آٹے دال کی

جن پر ہیں چار پیسے وہی ہیں یہاں امیر
اور جتنے پیشہ‌ور ہیں وہ کیا خرد کیا کبیر
اور جن کے پاس کچھ نہیں وہ ہیں نرے فقیر
روٹی کا سلسلہ ہے بڑا کیا کہوں **نظیر**

سب چھوڑو بات طوطی و پدڑی و لال کی
یارو کچھ اپنی فکر کرو آٹے دال کی

******

روٹی

جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں
پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں
سینے اُپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں یہ سب دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے جس کا ناک تلک پیٹ ہے بھرا
کرتا پھرے ہے کیا وہ اُچھل کود جا بجا
دیوار پھاند کر کوئی کوٹھا اُچھل گیا
ٹھٹھا ہنسی شراب صنم ساقی اس سوا
سو سو طرح کی دھوم مچاتی ہیں روٹیاں

جس جا پہ ہانڈی چولھا توا اور تنور ہے
خالق کی قدرتوں کا اُسی جا ظہور ہے
چولھے کے آگے آنچ جو جلتی حضور ہے
جتنے ہیں نور سب میں یہی خاص نور ہے
اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں

آوے توے تنور کا جس جا زباں پہ نام
یا چکی چولھے کا جہاں گلزار ہو تمام
یاں سر جھکا کے کیجئے ڈنڈوت اور سلام
اس واسطے کہ خاص یہ روٹی کے ہیں مقام
پہلے انہیں مکانوں میں آتی ہیں روٹیاں

ان روٹیوں کے نور سے سب دل ہیں پور پور
آٹا نہیں ہے چھلنی سے چھن چھن گرے ہے نور

پیڑا ہر ایک اس کا ہے برفی و موتی چور
ہر گز کسی طرح نہ بجھے پیٹ کا تنور
اس آگ کو مگر یہ بجھاتی ہیں روٹیاں

روٹی جب آئی پیٹ میں سو قند گھل گئے
گلزار پھولے آنکھوں میں اور عیش تل گئے
دو تر نوالے پیٹ میں جب آکے ڈھل گئے
چودہ طبق کے جتنے تھے سب بھید کھل گئے
یہ کشف یہ کمال دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو
میلے کی سیر خواہش باغ و چمن نہ ہو
بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو
سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بجھن نہ ہو
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

اب جن کے آگے مال پوے بھر کے تھال ہیں
پوری بھگت انہیں کی وہ صاحب کے لال ہیں
اور جن کے آگے روغنی اور شیر مال ہیں
عارف وہی ہیں اور وہی صاحب کمال ہیں
پکی پکائی اب جنہیں آتی ہیں روٹیاں

کپڑے کسی کے لال ہیں روٹی کے واسطے
لنبے کسی کے بال ہیں روٹی کے واسطے
باندھے کوئی رومال ہیں روٹی کے واسطے
سب کشف اور کمال ہیں روٹی کے واسطے
جتنے ہیں روپ سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے ناچے پیادہ قواعد دکھا دکھا
اسوار ناچے گھوڑے کو کاوا لگا لگا

گھنگرو کو باندھے پیک بھی پھرتا ھے جا بجا
اور اس سوا جو غور سے دیکھا تو جا بجا
سو سو طرح کے ناچ دکھاتی ھیں روٹیاں

اشرافوں نے جو اپنی یہ ذاتیں چھپائی ھیں
سچ پوچھیے تو اپنی یہ شانیں بڑھائی ھیں
کہیے اُنھوں کی روٹیاں کس کس نے کھائی ھیں
اشراف سب میں کہیے تو اب نان بائی ھیں
جن کی دکاں سے ھر کہیں جاتی ھیں روٹیاں

بھٹیاریاں کہاویں نہ اب کیونکہ رانیاں
مہتر خصم ھیں اُن کے وہ ھیں مہترانیاں
ذاتوں میں جتنے اور ھیں قصے کہانیاں
سب میں انھیں کی ذات کی اونچی ھیں بانیاں
کس واسطے کہ سب یہ پکاتی ھیں روٹیاں

دنیا میں اب بدی نہ کہیں اور نکوئی ھے
نا دشمنی و دوستی نا تند خوئی ھے
کوئی کسی کا اور کسی کا نہ کوئی ھے
سب کوئی ھے اُسی کا کہ جس ھاتھ ڈوئی ھے
نوکر نفر غلام بناتی ھیں روٹیاں

******

خوشامد

دل خوشامد سے ہر اک شخص کا کیا راضی ہے
آدمی جن و پری بھوت بلا راضی ہے
بھائی فرزند بھی خوش باپ چچا راضی ہے
شاہ مسرور غنی شاد گدا راضی ہے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

اپنا مطلب ہو تو مطلب کی خوشامد کیجئے
اور نہ ہو کام تو اس ڈھب کی خوشامد کیجئے
انبیا اولیا اور رب کی خوشامد کیجئے
اپنے مقدور غرض سب کی خوشامد کیجئے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

چار دن جس کو خوشامد سے کیا جھک کے سلام
وہ بھی خوش ہوگیا اپنا بھی ہوا کام میں کام
بڑے عاقل بڑے دانا نے نکالا ہے یہ دام
خوب دیکھا تو خوشامد ہی کی آمد ہے تمام

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

مفلس ادنیٰ و غنی کی بھی خوشامد کیجئے
بخیل اور سخی کی بھی خوشامد کیجئے
اورجو شیطان ہو تو اُس کی بھی خوشامد کیجئے
گر ولی ہو تو ولی کی بھی خوشامد کیجئے

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

پینے اور پہننے کھانے کی خوشامد کیجئے
ہیجڑے بھانڈ زنانے کی خوشامد کیجئے
مست و ہوشیار دوانے کی خوشامد کیجئے
بھولے نادان سیانے کی خوشامد کیجئے
جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

عیش کرتے ہیں وہی جن کا خوشامد کا مزاج
جو نہیں کرتے وہ رہتے ہیں ہمیشہ محتاج
ہاتھ آتا ہے خوشامد سے مکاں مالک اور راج
کیا ہی تاثیر کی اس نسخہ نے پائی ہے رواج
جو خرشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

گر بھلا ہو تو بھلے کی بھی خوشامد کیجے
اور برا ہو تو برے کی بھی خوشامد کیجے
پاک نا پاک سڑے کی بھی خوشامد کیجے
کتے بلی و گدھے کی بھی خوشامد کیجے
جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

بی بی کہتی ہے میاں آ ترے صدقے جاؤں
ساس بولے کہیں مت جا ترے صدقے جاؤں
خالا کہتی ہے کہ کچھ کھا ترے صدقے جاؤں
سالی کہتی ہے کہ بھیا ترے صدقے جاؤں
جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا رضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

جو کہ کرتے ہیں خوشامد وہ بڑے ہیں انساں
جو نہیں کرتے وہ رہتے ہیں ہمیشہ حیراں

ہاتھ آتے ہیں خوشامد سے ہزاروں ساماں
جس نے یہ بات نکالی ہے میں اس کے قرباں
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

گر نہ میٹھی ہو تو کڑوی بھی خوشامد کیجے
کچھ نہ ہو پاس تو خالی بھی خوشامد کیجے
جانی دشمن ہو تو اس کی بھی خوشامد کیجے
سچ اگر پوچھو تو جھوٹی بھی خوشامد کیجے
جو خوشامد کرے اس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

مردوزن طفل و جواں خردوکلاں پیر و فقیر
جتنے عالم میں ہیں محتاج و گدا شاہ و وزیر
سب کے دل ہوتے ہیں پھندے میں خوشامد کے اسیر
تو بھی واللہ بڑی بات یہ کہتا ہے **نظیر**
جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

******

انسان دوستی

آدمی نامہ

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زر دار بینوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا
شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا
یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور
یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور
شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں
اور آدمی ہی اُن کی چراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی ہی تیغ سے مارے ہے آدمی

پگڑی بھی آدمی کی آتارے ہے آدمی
چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ناچے ہے آدمی ہی بجا تالیوں کو یار
اور آدمی ہی ڈالے ہے اپنی ازار آتار
ننگا کھڑا اچھلتا ہے ہوکر ذلیل و خوار
سب آدمی ہی ہنستے ہیں دیکھ اس کو بار بار
اور وہ جو مسخرہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہولے کے مال
اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال
سچا بھی آدمی ہی نکلتا ہے میرے لال
اور جھوٹھ کا بھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار
اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقہ صراحی جوتیاں دوڑیں بغل میں مار
کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں آدمی کہار
اور اس پہ جو چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا
کہتا ہے کوئی لو کوئی کہتا ہے لارے لا
اوز آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا
کس کس طرح سے بیچے ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی قہر سے لڑتے ہیں گھور گھور
اور آدمی ہی دیکھ انھیں بھاگتے ہیں دور
چاکر غلام آدمی اور آدمی مزور
یاں تک کہ آدمی ہی اٹھاتے ہیں جا ضرور
اور جس نے وہ پھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی لعل جواہر ہے بے بہا
اور آدمی ہی خاک سے بدتر ہے ہوگیا
کالا بھی آدمی ہے اور الٹا ہے جوں توا
گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا سا چاند کا
بد شکل و بد نما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں
روپے کے ان کے پانوں ہیں سونے کے فرق میں
جھمکے تمام غرب سے لے تابہ شرق ہیں
کمخواب تاش شال دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

حیران ہوں یارو دیکھو تو کیا یہ سوانگ ہے
اور آدمی ہی چور ہے اور آپ ہی تھانگ ہے
ہے چھینا جھپٹی اور کہیں مانگ تانگ ہے
دیکھا تو آدمی ہی یہاں مثل رانگ ہے
فولاد سے گڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار
نہلا دھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زار زار
سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کا کاروبار
اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر
ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہیں اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر

اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

تقریبات

شب برات

کیونکر کرے نہ اپنی نموداری شب برات
چلپک چپاتی حلوے سے ہے بھاری شب برات
زندوں کی ہے زباں کی مزیداری شب برات
مردوں کی روح کی ہے مددگاری شب برات
لگتی ہے سب کے دل کو غرض پیاری شب برات

شکر کا جن کے حلوا ہوا وہ تو پورے ہیں
گڑ کا ہوا ہے جن کے وہ ان سے ادھورے ہیں
شکر نہ گڑ کا جن کے وہ پرکٹ لنڈورے ہیں
اوروں کے میٹھے حلوے چپاتی کو گھورے ہیں
ان کی نہ آدھی پاؤ نہ کچھ ساری شب برات

دنیا کی دولتوں میں جو زردار ہیں بڑے
قندوں کے حلوے روغنی نانیں لئے کھڑے
پہونچاتے خوان پھرتے ہیں نوکر کئی پڑے
زندے بھی راہ تکتے ہیں مردے بھی ہیں کھڑے
ان خوبیوں کی رکھتی ہے تیاری شب برات

تھلیا چپاتی حلوے کی تو سب میں چال ہے
ادنیٰ غریب کے تئیں یہ بھی محال ہے
کالے سے گڑ کی لپٹی کڑھی کی مثال ہے
پانی سے هانڈی گیہوں کی روٹی بھی لال ہے
کرتی ہے ایسی دکھیا پسنہاری شب برات

اور مفلسوں کی ہے یہ تمنا کی فاتحہ
دریا پہ جا کے دیتے ہیں بابا کی فاتحہ

بھٹیاری کے تنور پہ نانا کی فاتحہ
حلوائی کی دکان پہ دادا کی فاتحہ

یاں تک تو ان پہ لائی ہے ناچاری شب برات

وارث ہیں جن کے جیتے وہ مردے بھی آن کر
حلوے چپاتی خوب ہی چکھتے ہیں پیٹ بھر
جن کا کوئی نہیں ہے وہ پھرتے ہیں در بدر
اوروں کے لگتے پھرتے ہیں کونوں سے گھر بہ گھر

آن کی ہے کھاری نون سے بھی کھاری شب برات

چھوڑے ہے لٹو تونبڑی ہردم بنا کے جو
حاکم کا پیادہ کہتا ہے یوں اس سے تلخ ہو
کپڑے بدن بچا کے جو چاہو سو چھوڑ دو
چھپر جلاؤ گے تو دلاوے گی صبح کو

تم سے چبوترے میں گنہگاری شب برات

گھن چکر اپنی دم میں کہیں چرخ کھاتے ہیں
ٹونٹے ہوائی سینک کہیں قہقہاتے ہیں
زینپٹ زپٹ پٹاخے کہیں غل مچاتے ہیں
لڑکوں کے باندھ غول کہیں لڑنے جاتے ہیں

کرتی ہے پھر تو ایسی دھواندھاری شب برات

آکر کسی کے سر پہ چھچھوندر لگی کڑی
اوپر سے اور ہوائی کی آکر پڑی چھڑی
ہوگئی گلے کا ہار پٹاخے کی ہر لڑی
پاؤں سے لپٹی شور مچا کر قلم تڑی

کرتی ہے پھر تو ایسی ستمگاری شب برات

چہرہ کسی کا جل گیا آنکھیں بھلس گئیں
چھاتی کسی کی جل گئی باھیں بھلس گئیں
ٹانگیں بچیں کسی کی تو رانیں بھلس گئیں
مونچھیں کسی کی پھک گئیں پلکیں بھلس گئیں

رکھے کسی کی ڈاڑھی پہ چنگاری شب برات

————

هولی

اس رت میں چمن پر بھی عجب رنگ چڑھا ہے
اور جنگل و بن پر بھی عجب رنگ چڑھا ہے
ہر شوخ کے تن پر بھی عجب رنگ چڑھا ہے
عاشق کے بدن پر بھی عجب رنگ چڑھا ہے

سب عیش کے رنگوں میں ہے ہم رنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

مارا ہے لپٹ ہولی کے رنگوں نے عجب جوش
جو رنگ میں اک خلق بنی پھرتی ہے گل پوش
ہیں ناچ کہیں راگ کہیں رنگ کہیں نوش
پیتے ہیں نشے عیش میں سب لوٹیں ہیں مدہوش

معجوں کہیں پیتے ہیں کہیں بنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

میخانے میں دیکھو تو عجب سیر ہے یارو
واں مست پڑے لوٹے ہیں اور کرتے ہیں ہو ہو
مستی سے سوا عیش نہیں ہوش کسی کو
شیشوں میں پیالوں میں صراحی میں خوشی ہو

اچھلے ہے پڑی بادۂ گلرنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

گا گا کے پکاریں کہیں رنگوں کی چھڑک ہے
مینا کی بھبک اور کہیں ساغر کی چھلک ہے

طبلوں کی صدائیں کہیں تالوں کی جھنک ہے
تالی کی بہاریں کہیں ٹھلیا کی کھڑک ہے
بجتا ہے کہیں دف کہیں مرچنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

مستی میں اٹھا آنکھ جدھر دیکھو اہاہا
ناچے ہے طوائف کہیں مٹکے ہے بھویا
چلتے ہیں کہیں جام کہیں سوانگ، کا چرچا
اور رنگ کو گلیوں میں جو دیکھو تو ہر اک جا
بہتی ہیں امنڈ کر جمن و گنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

بھاگے ہے کہیں رنگ کسی پر جو کوئی ڈال
وہ پوٹلی مارے ہے اسے دوڑ کے فی الحال
یہ ٹانگ گھسیٹے ہے تو وہ کھینچر پکڑ بال
وہ ہاتھ مڑورے تو یہ توڑے ہے کھڑا گال
اس ڈھب کے ہر جا پہ مچے ڈھنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

بیٹھے ہیں سب آپس میں نہیں ایک بھی کڑوا
پچکاری اٹھا کر کوئی جھمکاوے ہے کوڑوا
بھرتے ہیں کہیں مشک کہیں رنگ کا گڑوا
کیا شاد وہ ہوتا ہے جسے کہتے ہیں بوڑوا
سننے میں یہاں تک نہیں اب ننگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

ہولی

جب آئی ہولی رنگ بھری سو ناز و ادا سے مٹک مٹک
اور گھونگٹ کے پٹ کھول دیئے وہ روپ دکھلا چمک چمک
کچھ مکھڑا کرتا دمک دمک کچھ ابرن کرتا جھلک جھلک
جب پاؤں رکھا خوشوقتی سے تب پائل باجی جھنک جھنک

کچھ اچھلیں سنتیں ناز بھریں کچھ گودیں آئیں تھرک تھرک

یہ روپ دکھا کر ہولی کے جب نین رسیلے ٹک مٹکے
منگوائے تھال گلالوں کے بھر ڈالے رنگوں سے مٹکے
پھر سانگ بہت تیار ہوئے اور ٹھاٹھ خوشی کے جھرمٹ کے
غل شور ہوئے خوشحالی کے اور ناچنے گانے کے کھٹکے

مردنگیں باجیں تال بجے کچھ کھنک کھنک کچھ دھنک دھنک

پوشاک چھڑکواں سے ہر جا تیاری رنگیں پوشوں کی
اور بھیگی جا گہ رنگوں سے ہر کنج گلی اور کوچوں کی
ہر جا گہ زرد لباسوں سے ہوئی زینت سب آغوشوں کی
سو عیش وطرب کی دھومیں ہیں اور محفل میں مے نوشوں کی

مے نکلی جام گلابی سے کچھ لہک لہک کچھ چھلک چھلک

ہر چار طرف خوشوقتی سے دف باجے رنگ اور رنگ ہوئے
کچھ دھومیں فرحت عشرت کی کچھ عیش وخوشی کے رنگ ہوئے
دل شاد ہوئے خوشحالی سے اور عشرت کے سو ڈھنگ ہوئے
یہ جھمکی رنگت ہولی کی جو دیکھنے والے دنگ ہوئے

محبوب پریرو بھی نکلے کچھ جھچک جھچک کچھ ٹھٹک ٹھٹک

جب خوباں آئے رنگ بھرے پھر کیا کیا ہولی جھمک اٹھی

کچھ حسن کی جھمکیں ناز بھریں کچھ شوخی نازاداؤں کی
سب چاھنے والے گرد کھڑے نظارہ کرتے ھنسی خوشی
محبوب نشے کی خوبی میں پھر عاشق اوپر گھڑی گھڑی
ھیں رنگ چھڑکتے سرخی کے کچھ لپک لپک کچھ جھپک جھپک

ھے دھوم خوشی کی ھر جانب اور کثرت ھے خوشوقتی کی
ھیں چرچے ھوتے فرحت کے اور عشرت کی بھی دھوم مچی
خوباں کے رنگیں چھروں پر ھر آن نگاھیں ھیں لڑتی
محبوب بھگوئیں عاشق کو اور عاشق ھنس کر اُن کو بھی
خوش ھوکر اُن کو بھگوویں ھیں کچھ اٹک اٹک کچھ ھمک ھمک

وہ شوخ رنگیلا جب آیا یاں ھولی کی کر تیاری
پوشاک سنہری زیب بدن اور ھاتھ چمکتی پچکاری
کی رنگ چھڑکنے سے کیا کیا اُس شوخ نے ھردم عیاری
ھم نے بھی نظیرؔ اُس چنچل کو پھر خوب بھگویا ھر باری
پھر کیا کیا رنگ بہے اُس دم کچھ ڈھلک ڈھلک کچھ چپک چپک

———

حکیمانہ

موت

جو مرنا مرنا کہتے ھیں وہ مرنا کیا بتلائے کوئی
واں جوھر باھیں کھول ملے سب اپنی اپنی چھوڑ دوئی
سی ڈالی آنکھ دورنگی کی جب یکرنگی نے مار سوئی
نہ مردوں کا غل شور رہا نہ عورت کی کچھ آہ اوئی

ماٹی کی ماٹی آگ آگن جل نیر پون کی پون ہوئی
اب کس سے پوچھے کون موا اور کس سے کہیئے کون موئی

نقارہ دھوں دھوں بجتا تھا اور کیا کیا تھی آواز بڑی
جب پھوٹ گیا پھر دیکھو تو آواز سب اسکی کہاں گئی
نر مادہ دونوں ایک ہوئے جب آن بھرم کی کھال پھٹی
نہ نر کا کچھ نرمول رہا نہ مادہ کی پہچان رہی

ماٹی کی ماٹی آگ اگن جل نیر پون کی پون ہوئی
اب کس سے پوچھے کون موا اور کس سے کہیئے کون موئی

ھر چار طرف اُجیالی تھی اس تیل سکوری پانی کی
وہ جوت نہ تھی اس دیئے کی تھی اور کسی کی اُجیالی
سب گھر کے بیچ اُجالا تھا کیا نوک بندی تھی نور بھری
جب دیوا بجھ کر سرد ہوا پھر چھائے گئی کل اندھیاری

ماٹی کی ماٹی آگ اگن جل نیر پون کی پون ہوئی
اب کس سے پوچھے کون موا اور کس سے کہیئے کون موئی

تھا جب تک خاصہ دودھ بنا تھی کیا کیا اسمیں چیز دھری
بّرقی ملائی ماکھن تھا اور کھویا گاڑھا اور تری

جب پھٹ کر ٹکڑے دودھ ہوا پھر کہاں گئی وہ چکنائی
نہ دودھ رہا نہ دھی رہا نہ روغن مسکہ چھاچھ سہی

ماٹی کی ماٹی آگ اگن جل نیر پون کی پون ہوئی
اب کس سے پوچھے کون موا اور کس سے کہیئے کون سوئی

یہ بات نہ سمجھے اور سنو جو لکڑی میں تھی آگ لگی
جب بجھ کر ٹھنڈی راکھ ہوئی پھر اسکی آنچ کہاں پھونچی
یہاں ایک طرف کو دولھا اور ایک طرف کو دولھن تھی
جب دونوں ملکر ایک ہوئے پھر بات رہی کیا پردے کی

ماٹی کی ماٹی آگ اگن جل نیر پون کی پون ہوئی
اب کس سے پوچھے کون موا اور کس سے کہیئے کون موئی

یہ نہ سمجھے اور سنو جو مٹکی ڈالی پانی میں
اور رستوں میں جب پھوٹ گئی ہاتھوں کی نیچا تانی میں
نہ راجہ کا سندیہ رہا نہ بھید رہا کچھ رانی میں
جا گھیرے مل گئے گھیروں میں اور پانی مل گیا پانی میں

ماٹی کی ماٹی آگ اگن جل نیر پون کی پون ہوئی
اب کس سے پوچھے کون موا اور کس سے کہیئے کون موئی

یہ بات نہ سمجھے اور سنو جو کپڑا پانی بھیگا تھا
جب سوکھا دھوپ کے اندر وہ پھر پانی اس کا کہاں گیا
سب مردہ مردہ بول آٹھے واں اور کسی نے رنگ بدلا
نہ بھرم رہا نر مادہ کا نہ دھوکا ہاتھی چیونٹی کا

ماٹی کی ماٹی آگ اگن جل نیر پون کی پون ہوئی
اب کس سے پوچھے کون موا اور کس سے کہیئے کون موئی

یاں جن کو مرنا ہے اے یار آنہیں کو ڈرنا ہے
جب دونوں دکھ سکھ دور ہوئے پھر جینا ہے نہ مرنا ہے

اس بھول بھلیاں چکر میں ٹک رستہ پیدا کرنا ہے
سب چھوڑ بھرم کی باتوں کو اس بات آپر دل دھرنا ہے

ماٹی کی ماٹی آگ اگن جل نیر پون کی پون ہوئی
اب کس سے پوچھے کون موا اور کس سے کہئیے کون موئی

حق نا حق آن سے کون لڑے جو مرنا سمجھے جینے کو
جینے کا رہنا نام رکھیں اور جینا کھانے پینے کو
جو مر گئے آگے مرنے سے وہ جانے بھید قرینے کو
ہو خاصی دولھن جا لپٹی اس لال بنے رنگ بھینے کو

ماٹی کی ماٹی آگ آگن جل نیر پون کی پون ہوئی
اب کس سے پوچھے کون موا اور کس سے کہئیے کون موئی

کیا صورت لوگ لگائی کی کیا نقشہ ناری نرپت کا
کیا رنگ بنے کا روپ ہوئے کیا سوانگ بنایا گت گت کا
جو سمجھیں انکو آساں ہے نہیں فرق ہے رائی پربت کا
بس اور نظیر اب کیا کہئیے ہے زور تماشا قدرت کا

ماٹی کی ماٹی آگ اگن جل نیر پون کی پون ہوئی
اب کس سے پوچھے کون موا اور کس سے کہئیے کون موئی

کل نفس ذائقہ الموت

دنیا میں اپنا جی کوئی بہلا کے مر گیا
دل تنگیوں سے اور کوئی اکتا کے مر گیا
عاقل تھا وہ تو آپ کو سمجھا کے مر گیا
بے عقل چھاتی پیٹ کے گھبرا کے مر گیا

دکھ پا کے مر گیا کوئی سکھ پا کے مر گیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مر گیا

دن رات دن مچی ہے یہاں اور پڑی ہے جنگ
چلتی ہیں نت اجل کی سناں گولی اور تفنگ
جس کا قدم بڑھا وہ سوا دو ہیں بے درنگ
جو جی چھپا کے بھاگا تو اس کا ہوا یہ رنگ

وہ بھاگتے میں تیغ و تبر کھا کے مر گیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مر گیا

بالفرض گر کسی کو ہوئی یاد کیمیا
یا مفلسی میں ایک نے خون جگر پیا
کوئی زیادہ عمر سے اک دم نہیں جیا
سوکھی کسی نے روٹی چبا غم میں جی دیا

قلیہ ، پلاؤ ، زردہ کوئی کھا کے مر گیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مر گیا

پہنا کسی نے خوب لباس عطر کا بھرا
یا چیتھڑوں کی گدڑی کوئی اوڑھ کر پھرا

آخر کو جب اجل کی چلی آن کر ہوا
پولے کے جھونپڑے کو کوئی چھوڑ کر چلا

باغ و مکاں محل کوئی بنوا کے مر گیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آکے مر گیا

گیسو بڑھا کے کوئی مشائخ ہوا یہاں
یا بینوا ہو کوئی ہوا خود منڈا یہاں
جب مرشد اجل کا قدم آیا درمیاں
کوئی تو لمبی ڈاڑھی لئیے ہوگیا رواں

مونچھیں بھویں تلک کوئی منڈوا کے مر گیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آکے مر گیا

گر ایک بے وقار ہو اور ایک قدر دار
سر پر لگا جب آن کے تیغ اجل کا وار
بے قدری کام آئی کسی کا نہ کچھ وقار
تھا بے حیا سو وہ تو موا کھو کے ننگ و عار

اور جس کو شرم تھی سو وہ شرما کے مر گیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آکے مر گیا

پھر کیا

کی وصل میں دلبر نے عنایات تو پھر کیا
یا ظلم سے دیں ہجر کی آفات تو پھر کیا
غصہ رہا یا پیار سے کی بات تو پھر کیا
گر عیش سے عشرت میں کٹی رات تو پھر کیا

اور غم میں بسر ہوگئی اوقات تو پھر کیا

جس شوخ پریزاد کی آ دل سے ہوئی چاہ
ہر طور ملے اس سے رہے عیش کے ہمراہ
ہنسنا بھی ہوا باتیں بھی اچھی ہوئیں دلخواہ
حد بوس و کنار اور جو تھا اس کے سوا آہ

گر وہ بھی میسر ہوا ہیہات تو پھر کیا

تھے وہ جو در و لعل سے بہتر لب و دنداں
آخر کو جو دیکھا تو ملے خاک میں یکساں
جن آنکھوں کو ملنا ہو بھلا خاک کے درمیاں
دو دن اگر ان آنکھوں نے دنیا میں مری جاں

کی ناز و اداؤں کی اشارات تو پھر کیا

دنیا میں اگر ہم کو ملا تخت سلیماں
تابع رہے سب جن و پری آدم و مرغاں
جب تن سے ہوا ہوگئی وہ پودنہ سی جاں
پھر اڑ گئی اک آن میں سب حشمت و سب شان

لے شرق سے تا غرب لگا بات تو پھر کیا

دولت میں اگر ہم ہوے دارا و سکندر
اور سات ولایت پہ کیا حکم سراسر
جب آئی اجل پھر نہ رہا تخت نہ افسر
اسپ و شتر و فیل و خر و نوبت و لشکر

گر قبر تلک اپنے چلا سات تو پھر کیا

طائر کی طرح سے اڑے ہم گرچہ ہوا پر
یا ارض کو طے کرگئے غوطہ سا لگا کر
دریا پہ چلے ایسے کہ پا بھی نہ ہوئے تر
جب ائی اجل آہ تو اک دم میں گئے مر

گر یہ بھی ہوئی ہم میں کرامات تو پھر کیا

گر اپنا ہوا منصب و جاگیر کا نقشا
ور ایک کو مر مر کے ملا بھیک کا ٹکڑا
کیا فرق ہوا دونوں میں جب مرنا ھی ٹھہرا
اس نے کوئی دن بیٹھ کے آرام سے کھایا

وہ مانگتا در در پھرا خیرات تو پھر کیا

دنیا میں لگا مفلس و درویش سے تا شاہ
سب زر کے طلبگار ھیں لے ماھی سے تا ماہ
مرتا ھے کوئی مال پہ ڈھونڈھے ھے کوئی جاہ
دولت ھی کا ملنا ھے بڑی چیز نظیر آہ !

بالفرض ہوئی اس سے ملاقات تو پھر کیا

گر شاہ سر پہ رکھ کر افسر ہوا تو پھر کیا
اور بحر سلطنت کا گوھر ہوا تو پھر کیا
ماھی، علم، مراتب پر زر ہوا تو پھر کیا ؟
نوبت، نشان، نقارہ در پر ہوا تو پھر کیا ؟

سب ملک سب جہاں کا سرور ہوا تو پھر کیا

یا رکھ کے فوج و لشکر کی سلطنت پناہی
پھیری دہائی اپنی لے ماہ تا بہ ماہی
جب آن کر فنا کی سر پر پڑی تباہی
پھر سر رہا نہ لشکر نہ تاج پاد شاہی

دارا و جم سکندر اکبر ہوا تو پھر کیا

یا راج بنسی ہو کر دنیا میں راج پایا
چتور گڑھ ستارہ کالنجر آ بنایا
جب توپ نے اجل کی آ مورچا لگایا
سب اڑ گئے ہوا پر کوئی نہ کام آیا

گڑھ، کوٹ، توپ، گولہ، سنگر ہوا تو پھر کیا

کتنوں نے بادشاہی کیا کیا خطاب پایا
مہریں بڑی کھدائیں، سکہ بڑا بنایا
جب آن کر فنا نے نام و نشاں مٹایا
وہ نام اور سکہ ڈھونڈھا کہیں نہ پایا

دو دن کا مہر چھاپا در پر ہوا تو پھر کیا

جاگیر میں کسی نے زر ریز ملک پایا
کر بندوبست اپنا نظم و نسق بٹھایا
لے کر سند اجل کا جب فوجدار آیا
اک دن میں حکم حاصل سب ہو گیا پرایا

ہانسی، حصار، ٹھٹھا، بھکر ہوا، تو پھر کیا

کہتا تھا کوئی یہ لشکر ہے طرہ باز خاں کا
یہ خیمہ، شامیانہ ہے شہنواز خاں کا
آیا کٹک اجل کے جب یکہ تاز خاں کا
سر بھی کہیں نہ پایا پھر سرفراز خاں کا

سردار، میر بخشی بڑھ کر ہوا، تو پھر کیا؟

ہاتھی پہ چڑھ کے نکلے یا خاصے گھوڑے اوپر
یا نالکی سنبھالی یا پالکی کی جھالر
یا لے صراحی حقہ دوڑے جلیب اندر
جب آ اجل پکاری صاحب رہا نہ نوکر

آقا ہوا تو پھر کیا نوکر ہوا تو پھر کیا

یا لے کے اک قلم داں اور رکھ قلم کو سر پر
جوڑے حساب لاکھوں چھرے لکھے سرا سر
جب عمر کی کچہری جھانکی قضا نے آ کر
پھر آپ نہ قلم‌داں کاغذ رہا نہ دفتر

منشی، وکیل، دیواں مرمر ہوا تو پھر کیا

یا لی قضا کی خدمت ہو بیٹھے آپ قاضی
محضر قبالے لکھے قضیے چکائے شرعی
اعلام نے قضا کا جب آ فنا پکاری
پھر محکمہ نہ جھگڑا، قاضی رہا نہ مفتی

کوڑا لبیدہ درہ در پر ہوا تو پھر کیا

کتوال بن کے بیٹھا یا صدر ہو مقرر
فاسق ڈرے ہزاروں اور کانپے چور تھر تھر
آیا قضا کا سردھا جسدم چھڑی اٹھا کر
کتوالی اور صدارت سب ہوگئی ہوا پر

دو دن کا خوف خطرہ اور ڈر ہوا تو پھر کیا

کہتے تھے کتنے ہم تو ہیں ذات میں کلاں جی
ہم شیخ ہم مغل ہیں ہم ہیں پٹھان ہاں جی
جس قدم قضا پکاری اب اٹھ چلو میاں جی
پھر شیخ جی نہ سید مرزا رہے نہ خاں جی

ذلت و حسب نسب کا جوہر ہوا تو پھر کیا

یا ہو سپاہی بانکا ترچھا بڑا کہایا
بل دار باندھ چیرا طرے کو جگمگایا
کھیتوں میں جاکے کودا لاکھوں کی تئیں بھگایا
جب منہ اجل کا دیکھا پھر کچھ بھی بن نہ آیا

بکتا شجاع بہادر صفدر ہوا تو پھر کیا

گھوڑا اٹھا کہ ڈوبا فوجوں میں ہو دل‌آور
سارے تپنچے بھالے کھائے کٹار جمدھر
مارا قضا نے بھالا جس دم فنا کا آکر
پھر مردمی شجاعت سب ہوگئی ہوا پر

خود و سلاح جلتہ بکتر ہوا تو پھر کیا

یا خانہ جنگی لڑ کر کھایا بدن میں ٹانکا
مونچھوں کو تاؤ دے کر سو دوت دات ہانکا
جب گھور کر قضا کے بانکے نے آکے جھانکا
ٹیڑھا رہا نہ ترچھا کنڈا رہا نہ بانکا

تیغا سپر فرابیں جمدھر ہوا تو پھر کیا

کیا ہندو اور مسلماں، کیا رند و گبر و کافر
نقاش کیا مصور، کیا خوش نویس، شاعر
جتنے نظیر یاں ہیں اک دم کے ہیں مسافر
رہنا نہیں کسی کو چلنا ہے سب کو آخر

دوچار دن کی خاطر یاں گھر ہوا تو پھر کیا

گر بادشاہ ہوکر عمل ملکوں ہوا تو کیا ہوا
دو دن کا نرسنگا بجا بھوں بھوں ہوا تو کیا ہوا
غل شور ملک و مال کا کوسوں ہوا تو کیا ہوا
یا ہو فقیر آزاد کے رنگوں ہوا تو کیا ہوا

گر یوں ہوا تو کیا ہوا اور ووں ہوا تو کیا ہوا

دو دن تو یہ چرچا ہوا گھوڑا ملا ہاتی ملا
بیٹھا اگر ہووے آپر یا پالکی میں جا چڑھا
آگے کو نقارا نشان پیچھے کو فوجوں کا پرا
دیکھا تو پھر اک آن میں باقی نہ گھوڑا نہ گدھا

گر یوں ہوا تو کیا ہوا اور ووں ہوا تو کیا ہوا

یا عشرتوں کے ٹھاٹھ تھے اور عیش کے اسباب تھے
ساقی صراحی گل بدن جام شراب ناب تھے
یا بیکسی کے درد سے بے خال تھے بے تاب تھے
آخر جو دیکھا دوستو سب کچھ خیال و خواب تھے

گر یوں ہوا تو کیا ہوا اور ووں ہوا تو کیا ہوا

تھا ایک دن وہ دھوم کا نکلے تھا جب اسوار ہو
ہر دم پکارے تھا نقیب آگے بڑھو پیچھے رہو
یا ایک دن دیکھا اسے تنہا پڑا پھرتا ہے وو
بس کیا خوشی کیا ناخوشی یکساں ہے سب اے دوستو

گر یوں ہوا تو کیا ہوا اور ووں ہوا تو کیا ہوا

گر ناز و نعمت میں رہا یعنی کہ وہ زر دار تھا
یا مفلسی کے ہاتھ سے محتاج ہو در در پھرا
جب وقت چلنے کا ہوا نہ یہ رہا نہ وہ رہا
آیا تھا جس احوال سے ویسا ہی آخر چل بسا

گر یوں ہوا تو کیا ہوا اور ووں ہوا تو کیا ہوا

جو عشرتیں آ کر ملیں تو وہ بھی کر جانا میاں
جو درد و دکھ آ کر پڑیں تو وہ بھی بھر جانا میاں
یا سکھ میں یا دکھ میں غرض یاں سے گزر جانا میاں
یاں چار دن کی زندگی آخر کو مرجانا میاں

گر یوں ہوا تو کیا ہوا اور ووں ہوا تو کیا ہوا

اب دیکھ کس کو شاد ہو اور کس پہ آنکھیں نم کرے
یہ دل بچارا ایک ہے کس کس کا اب ماتم کرے
یا دل کو رووے بیٹھ کر یا درد دکھ کو کم کرے
یاں کا یہی طوفان ہے اب کس کی جوتی غم کرے

گر یوں ہوا تو کیا ہوا اور ووں ہوا تو کیا ہوا

گر تو نظیر اب مرد ہے تو جال میں بھی شاد ہو
دستار میں بھی ہو خوشی رومال میں بھی شاد ہو
آزادگی بھی دیکھ لے جنجال میں بھی شاد ہو
اس حال میں بھی شاد ہو اس حال میں بھی شاد ہو

گر یوں ہوا تو کیا ہوا اور ووں ہوا تو کیا ہوا

انجام

جہاں ہے جب تلک یاں سینکڑوں شادی و غم ہونگے
ہزاروں عاشق جانباز اور لاکھوں صنم ہونگے
کنار و بوس اور عیش و طرب بھی دم بدم ہونگے
مگر جتنے یہ اپنی صف کے ہیں یہ سب عدم ہوں گے

نہ یہ چہلیں نہ یہ دھومیں نہ یہ چرچے بہم ہوں گے
میاں اک دن وہ آوے گا نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

تمہارا اب ہے جتنا حسن کا عالم غنیمت ہے
اگر ہے بیش تو بہتر وگرنہ کم غنیمت ہے
ہمارا دیکھنا اور عاشقی کا دم غنیمت ہے
بھروسا کچھ نہیں دم کا عزیزو دم غنیمت ہے

نہ یہ چہلیں نہ یہ دھومیں نہ یہ چرچے بہم ہوں گے
میاں اک دن وہ آوے گا نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

چمن میں چل کے بیٹھو اور صراحی جام منگواؤ
پیو بھر بھر کے ساغر تم بھی اور ہم کو بھی پلواؤ
گلے لپٹو ہمارے اور ہمیں ہنس ہنس کے بوسہ دو
اجل کافر گھڑی ہے سر پہ اے دلدار سنتے ہو۔

نہ یہ چہلیں نہ یہ دھومیں نہ یہ چرچے بہم ہوں گے
میاں اک دن وہ آوے گا نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

جو آگے عاشق و معشوق تھے سب مل گئے گل میں
اجل کی تیغ سے دونوں کے تکے اڑگئے تل میں
نہ قاتل میں رہا جی اور نہ آس قاتل کے بسمل میں
تو بس اے دلبرو تم بھی یہی اب جان لو دل میں

نہ یہ چہلیں نہ یہ دھومیں نہ یہ چرچے بہم ہوں گے
میاں اک دن وہ آوے گا نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

دنیا میں کوئی شاد کوئی دردناک ہے
یا خوش ہے یا الم کے سبب سینہ چاک ہے
ہر ایک دم سے جان کا ہر دم تپاک ہے
ناپاک ہے پلید نجس یا کہ پاک ہے

جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

وہ شخص تھے جو سات ولایت کے بادشاہ
حشمت میں جن کی عرش سے اونچی تھی بارگاہ
مرتے ہی اُن کے تن ہوئے گلیوں کی خاک راہ
اب اُن کے حال کی بھی یہی بات ہے گواہ

جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

کس کس طرح کے ہو گئے محبوب کج کلاہ
تن جن کے مثل پھول تھے اور منہ بھی رشک ماہ
جاتی ہے ان کی قبر پہ جس دم مری نگاہ
روتا ہوں پھر تو میں یہی کہہ کہہ کے دل میں آہ

جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

وہ گورے گورے تن کہ جنہوں کی تھی دلمیں جائے
ہوتے تھے میلے اُن کے کوئی ہاتھ گر لگائے
سو ویسے تن کو خاک بنا کر ہوا اڑائے
رونا مجھے تو آتا ہے اب کیا کہوں میں ہائے

جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

گر ایک کو ہزار روپے کا ملا کفن
اور اک یونہیں پڑا رہا بیکس برہنہ تن
کیڑے مکوڑے کھا گئے دونوں کے تن بدن
دیکھا جو ہم نے آہ تو سچ ہے یہی سخن

جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

جتنے جہاں میں ناج ہیں کنگنی سے تا گیہوں
اور جتنے میوجات ہیں تر خشک گونا گوں
کپڑے جہاں تلک ہیں سپید و سیہ نموں
کمخواب ، تاش ، بادلہ کس کس کا نام لوں

جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

جتنے جہاں میں دیکھو ہو بوٹے سے تا بہ جھاڑ
بڑ ، پیپل ، آنب ، نیب ، چھوارا ، کھجور ، تاڑ
سب خاک ہونگے جبکہ فنا ڈالے گی اکھاڑ
کیا بوٹے ڈیرھ پات کے کیا جھاڑ کیا پہاڑ

جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

گڑھ ، کوٹ ، توپ ، رھکلہ تیغ و کمان و تیر
باغ و چمن ، محل و مکانات دل پذیر
ہونا ہے سب کو آہ اسی خاک میں خمیر
میری زباں پہ اب تو یہی بات ہے نظیر

جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

پڑھ علم کئی اس دنیا میں گر کامل ذی ادراک ہوئے
اور لاد کتابیں اونٹوں پر ہر معنی کے دراک ہوئے
معقول پڑھی منقول پڑھی ہر منطق میں چالاک ہوئے
ہاں جتنے علم کے دریا ہیں ان دریا کے پیراک ہوئے

سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ہوئے

لے ہاتھ قلم اور باندھ سپر گر ہوئے سپاہی متصدی
دن رات لڑے گڑھ کاغذ سے شمشیر کھنچی اور قلم چلی
جب کلک قضا نے حرف لکھے اور سیف اجل کی چمکی
یاں دفتر طبلک ڈوب گئے واں تیغ سپر بھی پٹ پڑی

سب جیتے جی کے جھگڑے ھیں سچ پوچھو تو کیا خاک ھوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ھوئے

یا کوٹھی کر کر سیٹھ ھوئے یا کھود زمین کو کھیتی کی
لکھ ڈالیں بہیاں لاکھوں کی بو ڈالی دھرتی بری بھلی
جب ھنڈی آئی مالک کی اور آکر جم کی بھیج لگی
یاں کوٹھی کوٹھے بیٹھ گئی وھاں کھیتی باڑی کھیت رھی

سب جیتے جی کے جھگڑے ھیں سچ پوچھو تو کیا خاک ھوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ھوئے

اس دنیا کی دھن دولت میں گر شاہ سلیماں جاہ چلے
یا ٹہرے میر و وزیراعظم یا راجہ بن کر آہ چلے
منھ دیکھ اجل کے لشکر کا تب لے کر گھر کی راہ چلے
نے ھاتھی گھوڑے سنگ گئے نہ تخت چھتر ھمراہ چلے

سب جیتے جی کے جھگڑے ھیں سچ پوچھو تو کیا خاک ھوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ھوئے

سب چھوڑ فقیر آزاد ھوئے یا دنیا داری لوٹ گئے
یا شال دوشالے اوڑھ پھرے یا اجلے پیوند گوٹ گئے
سنگ اور قضا کے سونٹے سے سر دونوں کے جب پھوٹ گئے
یاں سیلی تاگے ٹوٹ گئے واں جامے تن کے چھوٹ گئے

سب جیتے جی کے جھگڑے ھیں سچ پوچھو تو کیا خاک ھوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ھوئے

گر بیر بخیلی زھر ھوئے یا بخشش میں تریاک ھوئے
یا نخل ھوئے پر میووں کے یا خالی پاتوں ڈھاک ھوئے
یا عمر گزاری عشرت میں یا سو غم میں غمناک ھوئے
پھل پھول کھلائے گلشن کے یا گلیوں کی خاشاک ھوئے

سب جیتے جی کے جھگڑے ھیں سچ پوچھو تو کیا خاک ھوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ھوئے

حکاک مصور زر گر تھے یا ھاتھ تبر اور تیشے تھے
یا پھیری سے دوکان بسی یا جنگل جنگل بیشے تھے
جو علم و ھنر ھم سیکھے تھے او جتنے اپنے پیشے تھے
بس اور نظیر اب کیا کہیئے سب نا حق کے اندیشے تھے
سب جیتے جی کے جھگڑے ھیں سچ پوچھو تو کیا خاک ھوئے
جب موت سے آ کر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ھوئے

بٹ مار اجل کا آ پہونچا ٹک اسکو دیکھ ڈرو بابا
اب اشک بہاؤ آنکھوں سے اور آھیں سرد بھرو بابا
دل ھاتھ اٹھا اس جینے سے لے بس من مار مرو بابا
جب باپ کی خاطر روتے تھے اب اپنی خاطر رو بابا
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ھوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

اب جینے کو تم رخصت دو اور مرنے کو مہمان کرو
خیرات کرو احسان کرو یا پن کرو یا دان کرو
یا پوری لڈو بٹواؤ یا خاصہ حلوا مان کرو
کچھ لطف نہیں اب جینے کا اب چلنے کا کچھ دھیان کرو
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ھوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ پاؤں گھسٹ کر چلنے سے مت رستے کو حیران کرو
اور پوپلے منھ سے روٹی کو مت مل مل در ھلکان کرو
اب آپ ھوئے تم پانی سے مت پانی کا نقصان کرو
کچھ لابھ نہیں ھے جینے میں اب مرنے سے پہچان کرو
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ھوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

گر اچھی کرنی نیک عمل تم دنیا سے لے جاؤ گے
تو گھر بھی اچھا پاؤ گے اور بیٹھ کے سکھ سے کھاؤ گے

اور ایسی دولت چھوڑ کے تم جو خالی ھاتھوں جاؤ گے
کچھ بات نہیں بن آنے کی گھبراؤ گے پچتاؤ گے

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ عمر جسے تم سمجھے ہو یہ ھر دم تن کو چنتی ھے
جس لکڑی کے بل بیٹھے ہو دن رات یہ لکڑی گھنتی ھے
تم گٹھری باندھو کپڑے کی اور دیکھ اجل سر دھنتی ھے
اب موت کفن کے کپڑے کا یاں تانا بانا بنتی ھے

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

گھر بار روپے اور پیسے میں مت دلکو تم خورسند کرو
یا گور بناؤ جنگل میں یا جمنا پر آنند درو
موت آن لتاڑے گی آخر کچھ مکر درو کچھ فند کرو
بس بہت تماشا دیکھ چکے اب آنکھیں اپنی بند کرو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

بیوپار تو یاں کا بہت کیا اب واں کا بھی کچھ سودا لو
جو کھیپ ادھر کو چڑھتی ھے اس کھیپ کو یاں سے لدوالو
اس راہ میں جو کچھ کھاتے ہو اس کھانے کو بھی منگوالو
سب ساتھی پہنچے منزل پر اب تم بھی اپنا رستا لو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

دو چار گھڑی یا دو دن میں اب تن سے جان نکلنی ھے
یہ ھڈی پسلی جتنی ھے یا کھلنی ھے یا جلنی ھے

ہے رات جو باقی تھوڑی سی کوئی دم میں یہ بھی ڈھلنی ہے
اٹھ باندھ لو کمر سویرے سے تم کو بھی منزل چلنی ہے

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ اونٹ کرائے کا یارو صندوق جنازہ باری ہے
جب اس پر ہوا سوار چلے پھر گھوڑا ہے نہ عماری ہے
کس نیند پڑے تم سوتے تھے یہ بوجھ تمہارا بھاری ہے
کچھ دیر نہیں اب آہ نظیر تیار کھڑی اسواری ہے

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

بنجارا

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گوئی پلا سر بھارا
کیا گیہوں ، چانول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں کیا انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

گر تو ہے لکھی بنجارا اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا ایک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکر مصری قند گری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا داکھ منقا سونٹھ مرچ کیا کیسر لونگ سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا
یا سود بڑھا کر لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا
دھن دولت ناتی پوتا کیا اک کنبا کام نہ آوے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ جینا ڈیرا ڈانڈا ہے
زر دام درم کا بھانڈا ہے بندوق سپر اور کھانڈا ہے
جب نایک تن کا نکل گیا جو ملکوں ملکوں بانڈا ہے
پھر ھانڈا ہے نہ بانڈا ہے نہ حلوا ہے نہ مانڈا ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ کھیپ بھرے جو جاتا ہے یہ کھیپ میاں مت گن اپنی
اب کوئی گھڑی پل ساعت میں یہ کھیپ بدن کی ہے کھپنی
کیا تھال کٹورے چاندی کے کیا پیتل کی ڈبیا ڈھپنی
کیا برتن سونے روپے کے کیا مٹی کی ھنڈیا چپنی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیوں جی پر بوجھ آٹھاتا ہے ان گونوں بھاری بھاری کے
جب موت کا ڈیرا آن پڑا پھر دونے ہیں بیوپاری کے
کیا ساز جڑاؤ زر زیور کیا گوٹے تھان کناری کے
کیا گھوڑے زین سنہری کے کیا ہاتھی لال عماری کے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

مغرور نہ ہو تلواروں پر مت پھول بھروسے ڈھالوں کے
سب پٹا توڑ کے بھاگیں گے منہ دیکھ اجل کے بھالوں کے
کیا ڈبے موتی ہیروں کے کیا ڈھیر خزانے مالوں کے
کیا بقچے تاش مشجر کے کیا تختے شال دوشالوں کے

سب ٹاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیا سخت مکاں بنواتا ہے کھم تیرے تن کا ہے پولا
تو اونچے کوٹ آٹھاتا ہے واں گور گڑھے نے منہ کھولا
کیا ریتی خندق رند بڑے کیا برج کنگورا انمولا
گڑھ کوٹ رہکلہ توپ قلعہ کیا شیشہ دارو اور گولا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر آن نفع اور ٹوٹے میں کیوں مرتا پھرتا ہے بن بن
ٹک غافل دل میں سوچ ذرا ہے ساتھ لگا تیرے دشمن
کیا لونڈی باندی دائی دوا کیا بندا چیلا نیک چلن
کیا مندر مسجد تال کنویں کیا گھاٹ سرا کیا باغ چمن

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب مرگ پھرا کر چابک کو یہ بیل بدن کا ہانکے گا
کوئی ناج سمیٹے گا تیرا کوئی گون سیے اور ٹانکے گا
ہو ڈھیر اکیلا جنگل میں تو خاک لحد کی پھانکے گا
اس جنگل میں پھر آہ نظیر اک بھنگا آن نہ جھانکے گا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

مناظر

برسات

اهل سخن کو ھے گا اک بات کا تماشا
اور عارفوں کی خاطر ھے ذات کا تماشا
دنیا کے صاحبوں کو دن رات کا ھے تماشا
ھم عاشقوں کو ھے گا سب گھات کا تماشا

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

خورشید گرم ھو کر نکلا ھے اپنے گھر سے
لیتا ھے مول بادل کر کر تلاش زر سے
آئی ھوا بھی لے کر بادل کو ھر نگر سے
آدھے اساڑھ تو اب دشمن کے گھر سے برسے

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

قاصد صبا کے دوڑے ھر طرف منھ اٹھا کر
ھر کوہ و دشت کو بھی کہتے ھیں یوں سنا کر
ھاں سبز جوڑے پہنو ھر دم نہا نہا کر
کوئی دم کو میگھ راجا دیکھے گا سب کو آ کر

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

جب یہ نوید پھونچی صحرا میں ایک باری
ھونے لگی وھاں پھر برسات کی تیاری
چشموں میں کوہ کے بھی ھوئی سب کی انتظاری
موسم کے جانور بھی آتے ھیں باری باری

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

ساون کے بادلوں سے پھر آ گھٹا جو چھائی
بجلی نے اپنی صورت پھر آن کر دکھائی

ہو مست رعد گرجا کوئل کی کوک آئی
بدلی نے کیا مزے کی رم جھم جھڑی لگائی

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

جن صاحبوں کے دل کو کچھ عیش سے ہی بھرا
وہ اس ہوا میں جا کر دیکھیں ہیں کوہ صحرا
ہر طرف آب سبزہ اور گلبدن سنہرا
جنگل میں آج منگل کس کس طرح کا لہرا

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

آ کر کہیں مزے کی ننھی پھہار برسے
چیزوں کا رنگ چھٹ کر حسن ونکھار برسے
اک طرف اولتی کی باہم قطار برسے
چھاجوں امنڈ کے پانی موسل کی دھار برسے

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

ہر کوہ کی کمر تک سبزہ ہے لہلہاتا
برسے ہے منہ جھڑا جھڑ پانی بہا ہے جاتا
وحش و طیور ہر اک مل مل کے ہے نہاتا
غوغا کریں ہیں مینڈک جھینگر ہے غل مچاتا

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

کالی گھٹا ہے ہر دم برسے ہیں منہ کی دھاریں
اور جس میں اڑ رہی ہیں بگلوں کی سو قطاریں
کوئل پپیہے کوکیں اور کوک کر پکاریں
اور مور مست ہوکر جوں کوکلا چنگاریں

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

کالی گھٹائیں آ کر ہو مست تل رہی ہیں
دستاریں سرخ اس میں کیا خوب کھل رہی ہیں
رخساروں پر بہاریں ہر اک کے ڈھل رہی ہیں
شبنم کی بوندیں جیسے ہر گل پہ تل رہی ہیں

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

آگے دکان کے نالا ہے موج مار چلتا
عالم طرح طرح کا آگے سے ہے نکلتا
کوئی چھپکتا پانی اور کوئی ہے پھسلتا
ٹھٹا ہے اور مزا ہے آب عنب ہے ڈھلتا

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

معمور ہیں جہاں کی سب تال اور تلیاں
سب بھر رہا ہے پانی اور سبز ابھریاں
اور ڈالیاں چمن کی بوندوں سے جھک ہیں ریاں
بادل بھرے ہیں جیسے معشوق ہیں دو گنیاں

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

ہے جو نظیر جن کی دھومیں اکستیاں ہیں
سب سے زیادہ اس کو اب عیش مستیاں ہیں
معشوق ہیں بغل میں اور مے پرستیاں ہیں
شعروں سے موتیوں کی بوندیں برستیاں ہیں

آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں

بوندوں کی جھمجھماوٹ قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہارین

جنگل سب اپنے تن پر ہریالی سج رہے ہیں
گل پھول جھاڑ بوٹے کر اپنی دھج رہے ہیں
بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہے ہیں
اللہ کے نقارے نوبت کے بج رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہر جا بچھا رہا ہے سبزا ہرے بچھونے
قدرت کے بچھ رہے ہیں ہر جا ہرے بچھونے
جنگلوں میں ہورہے ہیں پیدا ہرے بچھونے
بچھوا دیے ہیں حق نے کیا کیا ہرے بچھونے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کیا کیا رکھے ہیں یارب سامان تیری قدرت
بدلے ہے رنگ کیا کیا ہر آن تیری قدرت
سب مست ہورہے ہیں پہچان تیری قدرت
تیتر پکارتے ہیں سبحان تیری قدرت

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئل کی کوک میں بھی تیرا ہی نام ہے گا
اور مور کی زٹل میں تیرا پیام ہے گا
یہ رنگ سو مزے کا جو صبح و شام ہے گا
یہ اور کا نہیں ہے تیرا ہی کام ہے گا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بولیں بئے بٹیریں قمری پکارے کو کو
پی ہی کرے پپیہا بگلے پکاریں تو تو
کیا ھدھدوں کی حق حق کیا فاختوں کی ھو ھو
سب رٹ رہے ھیں تجھ کو کیا پنکھ کیا پکھیرو

کیا کیا مچی ھیں یارو برسات کی بہاریں

کتنوں نے اپنی غم سے اب ھے یہ گت بنائی
میلے کچیلے کپڑے آنکھیں بھی ڈبڈبائی
نے گھر میں جھولا ڈالا نے اوڑھنی رنگائی
پھوٹا پڑا ھے چولھا ٹوٹی پڑی کڑھائی

کیا کیا مچی ھیں یارو برسات کی بہاریں

گاتی ھے گیت کوئی جھولے پہ کرکے پھیرا
مارو جی آج کیجے یاں رین کا بسیرا
ھے خوش کسی کو آ کر ھے درد و غم نے گھیرا
منھ زرد بال بکھرے اور آنکھوں میں اندھیرا

کیا کیا مچی ھیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے تو بھنگ پی پی کپڑے بھگو رہے ھیں
باھیں گلوں میں ڈالے جھولوں میں سو رھے ھیں
کتنے برہ کے مارے سدھ اپنی کھو رھے ھیں
جھولے کی دیکھ صورت ھر آن رو رھے ھیں

کیا کیا مچی ھیں یارو برسات کی بہاریں

بیٹھے ھیں کتنے خوش ھو اونچے چھوا کے بنگلے
پیتے ھیں مے کے پیالے اور دیکھتے ھیں جنگلے
کتنے پھرے ھیں باھر خوباں کو اپنے سنگ لے
سب شاد ھورھے ھیں عمدہ غریب کنگلے

کیا کیا مچی ھیں یارو برسات کی بہاریں

مدت سے ہورہا ہے جن کا مکاں پرانا
اٹھ کے ہے آن کو مینھ میں ہر آن چھت پہ جانا
کوئی پکارتا ہے ٹک موری کھول آنا
کوئی کہے ہے چل بھی کیوں ہوگیا دوانا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی پکارتا ہے لو یہ مکان ٹپکا
گرتی ہے چھت کی مٹی اور سائبان ٹپکا
چھلنی ہوئی اٹاری کوٹھا ندان ٹپکا
باقی تھا اک آسارا سو وہ بھی آن ٹپکا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

سبزوں پہ بیر بھوٹی ٹیلوں اوپر دھتورے
پسو سے مچھروں سے روئے کوئی بسورے
بچھو کسی کو کاٹے کیڑا کسی کو گھورے
آنگن میں کنسلائی کونوں میں کھنکھجورے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

پھنسی کسی کے تن میں سر پر کسی کے پھوڑے
چھاتی پہ گرمی دانے اور پیٹھ میں ددوڑے
کھا پوریاں کسی کو ہیں لگ رہے مڑوڑے
آتے ہیں دست جیسے دوڑیں عراقی گھوڑے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہیں جن کے تن ملائم میدے کی جیسے لوئی
وہ اس ہوا میں خاصی اوڑھے پھرے ہے لوئی
اور جن کی مفلسی نے شرم و حیا ہے کھوئی
ہے آن کے سر پہ سر کی یا بوریے کی کھوئی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے پھرے ہیں اوڑھے پانی میں سرخ پٹو
جو دیکھ سرخ بدلی ہوتی ہے آن پہ لٹو
کتنوں کی گاڑی رتھ ہیں کتنوں کے گھوڑے ٹٹو
جس پاس کچھ نہیں ہے وہ ہم سا ہے نکھٹو

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو اس ہوا میں یارو دولت میں کچھ بڑے ہیں
ہے آن کے سرپہ چھتری ہاتھی آپر چڑھے ہے
ہم سے غریب غربا کیچڑ میں گر پڑے ہیں
ہاتھوں میں جوتیاں ہیں اور پائنچے چڑھے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کیچڑ سے ہورہی ہے جس جا زمیں پھسلنی
مشکل ہوئی ہے واں سے ہر اک کو راہ چلنی
پھسلا جو پانوں پگڑی مشکل ہے پھر سنبھلنی
جوتی گری تو واں سے کیا تاب پھر نکلتی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے تو کیچڑوں کی دلدل میں پھنس رہے ہیں
کپڑے تمام گندی دلدل میں بس رہے ہیں
کتنے اٹھے ہیں مر مر کتنے آ کس رہے ہیں
وہ دکھ میں پھنس رہے ہیں اور لوگ ہنس رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

گر کر کسی کے کپڑے دلدل میں ہیں معطر
پھسلا کوئی کسی کا کیچڑ میں منہ گیا بھر
اک دو نہیں پھسلتے کچھ اس میں آن اکثر
ہوتے ہیں سیکڑوں کے سر نیچے پاؤں اوپر

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

انتخاب غزلیات

انتخاب غزلیات

دل کو چشم یار نے جب جام مئے اپنا دیا
اُن سے خوش ہو کر لیا اور کہہ کے بسم اللہ پیا

دیکھ اُس کی جامہ زیبی گل نے اپنا پیرہن
اس قدر پھاڑا کہ بلبل سے نہیں جاتا سیا

بےقراری نے نگاہ سیمبر پھیری ادھر
کی عنایت ہم کو اس سیماب نے یہ کیمیا

اس کے کوچے میں جسے جا بیٹھنے کو مل گئی
مسند زرباف پر غالب ہے اس کا بوریا

دل چھپا بیٹھا تو اس زلف مسلسل سے نظیر
اے اسیر دام نافہمی یہ تونے کیا کیا

نہ جاؤں میں تو اُسکے پاس لیکن کیا کروں یارو
یکایک کچھ جگر میں آ کے اگ جاتا ہے نشتر سا

وہ رشک چمن کل جو زیب چمن تھا
چمن جنبش شاخ سے سینہ زن تھا

گیا میں جو اُس بن چمن میں، تو ہر گل
مجھے اُس گھڑی اخگر پیرہن تھا

یہ غنچہ جو بے درد گلچیں نے توڑا
خدا جانے کس کا یہ نقش دہن تھا

تن مردہ کو کیا تکلف سے رکھنا
گیا وہ تو، جس سے مزین یہ تن تھا

کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا
مشین بدن تھا، معطر کفن تھا

جو قبر کہن اُن کی اُکھڑی تو دیکھا
نہ عضو بدن تھا، نہ تار کفن تھا

بتوں کی مجلس میں شب کو مہرو جو اور ٹک بھی قیام کرتا
کنشت ویراں، صنم کو بندہ، برہمنوں کو غلام کرتا

خراب خستہ سمجھ کے تونے پیارے مجھ کو عبث نکالا
جو رہنے دیتا تو گلرخوں میں قسم ہے تیری میں نام کرتا

کڑوڑوں دل جو موے پڑے ہیں، نکلتے خونیں کفن سے نالاں
قیامت آجاتی جو وہ قامت گلی میں اپنی خرام کرتا

نہ اتنے قصے نہ جنگ ہوتی، پیارے تیرے ملاپ اوپر
رقیب آپی سے زہر کھاتے جو وصل کا تو پیام کرتا

وہ سرو قامت جو مسکرا کر چمن میں جاتا تو مسکرا کر
تڑپتی بلبل، سسکتی قمری، گلوں پہ ہنسنا حرام کرتا

بھلا ہوا جو نقاب تونے .اٹھایا چہرے سے ہے پری رو
وگر نہ سینے سے دل تڑپ کر نگہ میں آکر مقام کرتا

جو زلفیں مکھڑے پہ کھول دیتا صنم ہمارا تو پھر یہ گردوں
نہ دن دکھاتا، نہ شب بتاتا، نہ صبح لاتا نہ شام کرتا

وہ بزم اپنی تھی میخوری کی، فرشتے ہوجاتے مست بیخود
جو شیخ جی واں سے بچ کے آتے تو پھر میں اُن کو سلام کرتا

نظیر تیری اشارتوں سے یہ باتیں غیروں کی سن رہا ہے
وگر نہ کس میں تھی تاب و طاقت جو اُس سے آکر کلام کرتا

نظر پڑا اک بت پری‌وش نرالی سج دھج نئی ادا کا
جو عمر دیکھو تو دس برس کی، پہ قہر و آفت غضب خدا کا

جو شکل دیکھو تو بھولی بھولی جو باتیں سنئے توُ میٹھی میٹھی
پہ دل وہ پتھر، کہ سر اُڑادے جو نام لیجیے کبھی وفا کا

جو گھر سے نکلے تو یہ قیامت کہ چلتے چلتے قدم قدم پر
کسی کو ٹھوکر، کسی کو جھکڑ، کسی کو گالی، نپٹ لڑاکا

یہ راہ چلنے میں چلبلاہٹ کہ دل کہیں ہے، نظر کہیں ہے
کہاں کا اونچا، کہاں کا نیچا، خیال کس کو قدم کی جا کا

لڑادے آنکھیں وہ بےحجابی کہ پھر پلک سے پلک نہ مارے
نظر جو نیچی کرے تو گویا کھلا سراپا چمن حیا کا

یہ چنچلاہٹ، یہ چلبلاہٹ، خبر نہ سر کی، نہ تن کی سد بدھ
جو چیرا بکھرا، بلا سے بکھرا، نہ بند باندھا کبھو قبا کا

گلے لپٹنے میں یوں شتابی، کہ مثل بجلی کے اضطرابی
کہیں جو چمکا چمک چمک کر، کہیں جو لپکا تو پھر جھپا کا
نہ وہ سنبھالے کسی کے سنبھلے، نہ وہ منائے منے کسی کے
جو قتل عاشق پہ آکے مچلے، تو غیر کا پھر نہ آشنا کا
یہ رم یہ نفرت یہ دور کھنچنا یہ ننگ عاشق کے دیکھنے سے
جو پتا کھڑکے ہوا سے لگ کر تو سمجھے کھٹکا نگہ کے پا کا
جتاوے الفت چڑھاوے ابرو ادھر لگاوٹ ادھر تقاتل
کرے تبسم جھڑک دے ہردم روش ہٹیلی چلن دغا کا

عشق میں عقل و ہوش کھونا تھا　　کیجے کیا اب ہوا جو ہونا تھا

پردہ اٹھا کر رخ کو عیاں اس شوخ نے جس ہنگام کیا
ہم تو رہے مشغول ادھر یاں عشق نے دل کا کام کیا
آ گئے جب صیاد کے بس میں سوچ کئے پھر حاصل کیا
اب تو اسی کی ٹھہری مرضی جن نے اسیر دام کیا
چشم نے چھینا پلکوں نے چھیدا زلف نے باندھا دل کو آہ
ابرو نے ایسی تیغ جڑی جو قصہ ہی سب اتمام کیا
سخت خجل ہیں اور شرمندہ رہ رہ کے پچھتاتے ہیں
خواب میں اس سے رات لڑے ہم کیا ہی خیال خام کیا

بیٹھو واں بھی کوئی بل کیا ہوگا　　ہم بھی عاشق ہیں خلل کیا ہوگا
دل ہی ہوسکتا ہے۔ اور اس کے بغیر　　جان من دل کا بدل کیا ہوگا

سنا تھا شور قاتل کی اکڑ کا　　نظر آیا تو دل سینے میں دھڑکا

کل اس کے چہرے کو ہم نے جو آفتاب لکھا
تو اس نے پڑھ کے وہ نامہ بہت عتاب لکھا

جبیں کو مہ جو لکھا تو کہا ہو چیں بہ جبیں
یہ کیسی اس کی سمجھ تھی جو ماہتاب لکھا

چمکتے دانتوں کو گوہر لکھا تو ہنس کے کہا
ستارے آڑ گئے تھے جو در خوش آب لکھا

لکھا جو مشک خطا زلف کو تو بل کھا کر
کہا خطا کی جو یہ حرف نا صواب لکھا

گلاب عرق کو لکھا تو بولا ناک چڑھا
اسے نہ عطر میسر تھا جو گلاب لکھا

جگر کباب لکھا اپنا، تو کہا جل کر
بھلا جی کیا میں شرابی تھا جو کباب لکھا

حساب شوق کا دفتر لکھا تو جھنجھلا کر
کہا میں کیا متصدی تھا جو حساب لکھا

جو بےحساب لکھا اشتیاق دل تو کہا
وہ کس حساب میں ہے یہ بھی بےحساب لکھا

ہوئی جو رد و بدل ایسی کتنی بار **نظیر**
تو اس نے خط کا ہمارے نہ پھر جواب لکھا

ایسا ہی جو وہ خفا رہے گا | تو چاہ میں کیا مزا رہے گا
مت ربط کر اس سے ورنہ اے دل | اپنے تو کیے کو پا رہے گا
دیکھیں گے ہم اک نگاہ اس کو | کچھ ہوش اگر بجا رہے گا
خوباں پہ میاں **نظیر** اپنا | ق ایسا ہی جو دل فدا رہے گا
پہلو سے نکل کے آخر اک دن | کوچے میں بتوں کے جا رہے گا

نہیں پھر چھوڑتا یارو وہ آخر لے ہی جاتا ہے
جہاں صیاد نے تاڑا کہ ہے اس جا شکار اپنا

ہو کے مہ وہ تو کسی اور کا بالا نکلا
ہم نے سمجھا تھا جسے گل سو وہ لالا نکلا

تھا ارادہ تری فریاد کریں حاکم سے
وہ بھی اے شوخ تیرا چاہنے والا نکلا

جی کی سب دھوم تھی جب تن سے وہ نکلا تو نظیر
پھر نہ سینے سے اٹھی آہ نہ نالا نکلا

ھاتھ اس کا جب نقاب کے گوشے تلک گیا
گوشہ اٹھا تو نور کا بقعہ جھلک گیا

ساقی نے بھر کے جام دیا ہم کو اس طرح
جو لب تک آتے آتے کئی جا چھلک گیا

آیا نظر وہ حسن جو اس کا تو دم بدم
گھر تک میں اس جھلک سے جھپکتا پلک گیا

رخ تو وہ ماھتاب سا دیکھا تن بھی موتی کی آب سا دیکھا
کی نگہ چشم پر تو اس کو بھی ساغر پر شراب سا دیکھا
پیرھن برگ گل پہ جوں شبنم عرق تن گلاب سا دیکھا
تھے ابھی ہم جواں نظیر اور اب ق رنگ مو سیم‌ناب سا دیکھا
شام کی صبح ہوگئی دم میں یہ تو کچھ ہم نے خواب سا دیکھا

سمجھے تھے یوں ہم دل کو لگا کر پاویں گے یاں آرام بہت
حیف اسی فہمید نے ہم کو کیا کیا بےآرام کیا

یہ بھلا ہوا جو اس نے نہ سحر نقاب الٹا
نہیں سوئے تحت پھرتا وھیں آفتاب الٹا
مجھے بیقرار کرنا جو نہ تھا اسے تو پھر کیوں
بصد انتظار آ کر بصد اضطراب الٹا

خجل اس کے آگے ہونے میں لگا تو وہ نگہ کی
کہ پہونچ کے تا در دل وہیں پھر حجاب الٹا

کہا پاؤں دابنے کو میں نے چوم لی کف پا
تو بجائے لطف کیا کیا بسر عتاب الٹا

مری خاک پر جو آیا تو ہنسا کہ لئے یہ گل ہیں
بڑی گل کھلا کے واں سے وہ صنم شتاب الٹا

بھرے جام چشم کیا کیا مئے اشک سے وہ میکش
جو اخیر بزم دیکھے قدح شراب الٹا

گیا گھر **نظیر** اس کے بہزار نامرادی
پہ ہزار شکر وہاں سے وہ ہو کامیاب الٹا

کلال گردوں اگر جہاں میں جو خاک میری کا جام کرتا
تو میں صنم کے لبوں سے مل کر عجب ہی عیش مدام کرتا

جو پاتا لذت بسبان مستاں مئے محبت سے تیری زاهد
تو خانقہ سے نکل کے اپنی وہ میکدے میں قیام کرتا

وہ بزم اپنی تھی مے کشی کی فرشتے ہوجاتے مست و بیخود
جو شیخ جی واں سے بچ کے آتے تو پھر میں ان کو سلام کرتا

نظیر آخر کو ہار کر میں گلی میں اس کی گیا تھا بکنے
تماشا ہوتا جو مجھ کو لے کر وہ شوخ اپنا غلام کرتا

عشق کا مارا نہ صحرا ہی میں کچھ چوپٹ پڑا
ہے جہاں اس کا عمل وہ شہر بھی ہے پٹ پڑا

شاید اس غنچہ دھن کو ہنستے دیکھا باغ میں
اب تلک غنچہ بلائیں لیتا ہے چٹ چٹ پڑا

دیکھ کر اس کے سراپا کو یہ کہتی ہے پری
سر سے لے کر پاؤں تک یاں حسن آکر پھٹ پڑا

اس مہر پر انوار سے' شبنم کی طرح، ہم
گم ہوتے گئے، ہم کو وہ جوں جوں نظر آیا

نہ گل اپنا نہ خار اپنا نہ ظالم باغباں اپنا
بنایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب
اہل صورت کا ہے دریا اہل معنی کا سراب

وہ عظیم الشان مکاں دہتی تھیں جن کی رفعتیں
ہنس کے طاق آسماں کو طاق ابرو سے جواب

وہ مطلا قصر وہ رنگیں منقش بام و در
وہ مرصع خواب گاہیں بہر عیش و بہر خواب

صحن میں بستاں سرا ایسے پر از غلمان و حور
جن کی انہاروں میں جائے آب و گل خالص گلاب

وہ مطلا قصر رنگین و منقش بام و در
جن کی رنگینی سے تھا قصر ارم کو پیچ و تاب

ان میں تھے وہ صاحب ثروت جنھیں کہتے تھے لوگ
کیقباد و قیصر و کیخسرو و افراسیاب

مہروش، بہرام صولت، بدر قدر و چرخ رخش
مشتری پیکر ثریا بارگہ کیواں جناب

وہ تجمل وہ تحمل وہ تفوق وہ غرور
وہ تحشم وہ تنعم وہ تعیش وہ شباب

ہر طرف فوج بتاں ہر سو ہجوم گل رخاں
جن کے عارض رنج ماہ و رشک روئے آفتاب

چشمک و آن و اشارات و ادا و سرکشی
طنز و تعریض و کنایت، غمزہ و ناز و عتاب

صبح سے لے شام تک اور شام سے لے تا بصبح
دمبدم رقص و سرود اور پے بہ پے جام شراب

ساقی و مطرب ندیم و مستی و مئے خوارگی
ساغر و مینا و گل، عطر و مئے و نقل و کباب

کثرت اہل نشاط و جوش۔ نوشا نوش مئے
از زمیں تا آسماں شور تنے و چنگ و رباب

وہ بہاریں وہ فضائیں وہ ہوائیں وہ سرور
وہ طرب و عیش کچھ جس کا نہیں حد و حساب

یا تو وہ ہنگامۂ تنشیط تھا یا دفعتاً
کر دیا ایسا کچھ اس دور فلک نے انقلاب

جو وہ سب جاتے رہے دم میں حباب آسا مگر
رہ گئے عبرت فزا وہ قصر ویران و خراب

تھا جہاں وہ مجمع رنگیں وہاں اب ہے تو کیا
نقش سم گور یا کہنہ کوئی پر عقاب

ہیں اگر دو خشت باہم تو لب افسوس ہیں
اور جو کوئی طاق ہے تو صورت چشم پر آب

خواب کہیے اس تماشے کو نظیر اب یا خیال
کچھ کہا جاتا نہیں واللہ اعلم بالصواب

———

بحر ہستی میں صحبت احباب
یوں ہے جیسے بروئے آب حباب

گردش آسماں میں ہم کیا ہیں
پر کا ہے میانۂ گرداب

بادۂ ناب کیا ہے خون جگر
زردیٔ رنگ ہے شب مہتاب

جس کو رقص و سرود کہتے ہیں
وہ بھی ہے اک ہوائے خانہ خراب

عمر کہتے ہیں جس کو وہ کیا ہے
مثل تحریر موج نقش بر آب

جسم کیا روح کی ہے جولانگاہ
روح کیا اک سوار پا برکاب

حسن اور عشق کیا ہیں یہ بھی ہیں　خطفۂ برق و قطرۂ سیماب
زندگانی و مرگ بھی کیا ہیں　ایک مثل خیال و دیگر خواب
فرصت عمر قطرۂ شبنم　وصل محبوب گوہر نایاب
کیوں نہ عشرت دو چند ہو جو ملے　یار مہ چہرہ اور شب مہتاب
سب کتابوں کے کھل گئے معنی　جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب

یوں ہم اس زلف میں آئے ہیں دل زار کو چھوڑ
جیسے جاتا ہے کوئی رات میں بیمار کو چھوڑ

ابھی تازہ حلقۂ زلف میں جو پھنسا ہے طائر دل، بھلا،
آسے رنج پہونچے ہے اے صبا تو گھڑی گھڑی نہ ہلا قفس

ہے یہ شور اس دل جلے کا اس کے در کے متصل
جیسے لگتی ہے کسی کے آگ گھر کے متصل
ہیں یہ زلفیں منھ پہ یا بدلی کے دو ٹکڑے سیاہ
چلتے چلتے تھم رہے آکر قمر کے متصل

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم
بس ترستے ہی چلے ، افسوس! پیمانے کو ہم
مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے، ساقی نہیں
دل میں آتا ہے لگادیں آگ میخانے کو ہم

کیوں نہیں لیتا ہماری تو خبر، اے بے خبر
کیا ترے عاشق ہوئے تھے درد غم کھانے کو ہم
ہم کو پھنسنا تھا قفس میں، کیا گلہ صیاد کا
بس ترستے ہی رہے ہیں آب اور دانے کو ہم
طاق ابرو میں صنم کے کیا خدائی رہ گئی
اب تو پوجیں گے اسی کافر کے بت خانے کو ہم

باغ میں لگتا نہیں، صحرا سے گھبراتا نہیں
اب کہاں لے جاکے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

کیا ہوئی تقصیر ہم سے، تو بتادے اے نظیر
تاکہ شادی مرگ سمجھیں ایسے مرجانے کو ہم

نہ اس کے نام سے واقف نہ اس کی جا معلوم
ملے گا دیکھیے کیوں کر وہ بت خدا معلوم

ہم اس پہ مرتے ہیں مدت سے اور وہ کہتا ہے
قسم خدا کی ہمیں تو یہ اب ہوا معلوم

تدبیر ہمارے ملنے کی جس وقت کوئی ٹھہراؤ گے تم
ہم اور چھپیں گے یاں تک جی جو خوب ہی پھر گھبراؤ گے تم

بیزار کروگے دل ہم سے یا منت در سے روکو گے
وہ دل تو ہمارے بس میں ہے کس طور اسے سمجھاؤ گے تم

گر جادو منتر سیکھو گے تو سحر ہماری نظروں کا
اس کوچے میں بٹھلاویں گے پھر کہئے کیوں کر آؤ گے تم

گر چھپ کر دیکھنے آؤ گے ہم اپنے بالا خانے کے
سب پردے چھوڑے رکھیں گے پھر کیوں کر دیکھنے پاؤ گے تم

گر جادو منتر سیکھو گے تو سحر ہماری نظروں کا
تاثیر کو اس کی کھودے گا کچھ پیش نہیں لے جاؤ گے تم

تصویر اگر منگواؤ گے تو دیکھ ہماری صورت کو
حیران مصور ہووے گا پھر رنگ کہو کیا لاؤ گے تم

جس وقت نظیر ان باتوں کی ہم خوب کریں گے ہشیاری
جو حرف زبان پر لاؤ گے تم پھر کیوں کر کر دکھلاؤ گے تم

وہ چاندنی میں جو ٹک سیر کو نکلتے ہیں
تو مہ کے طشت میں گھی کے چراغ جلتے ہیں

ھجوم آہ ہے آنکھوں سے اشک ڈھلتے ہیں
بھرے ہیں چاؤ جو دل میں سو یوں نکلتے ہیں

چراغ صبح یہ کہتا ہے آفتاب کو دیکھ
یہ بزم تم کو مبارک ہو ہم تو چلتے ہیں

برنگ اشک کبھی گر کے ہم نہ سنبھلے آہ
یہی کہا کئے جی میں کہ اب سنبھلتے ہیں

کیا کاسۂ سر لیجئے اس بزم میں اے ہم نشیں
دور فلک سے کیا خبر پہونچے گا لب تک یا نہیں

ہو اعتماد اس کا کسے ہے شیشہ بازی یاد اسے
رکھتا ہے شاد اک دم جسے کرتا ہے پھر اندوھگیں

کل دامن صحرا میں ہم گزرے جو وقت صبحدم
اک کاسۂ سر پر الم آیا نظر اپنے وہیں

بولا بہ فریاد و فغاں کیا دیکھتا ہے او میاں
تھے ہم بھی سر بر آسماں گو اب تو ہیں زیر زمیں

گلبرگ سے نازک بدن سر پاؤں سے رشک چمن
زریں و سیمیں پیرھن دلکش مکانوں کے مکیں

دن رات ناز و نعمتیں مہ طلعتوں کی صحبتیں
عیش و نشاط و عشرتیں ساقی قران مطرب قریں

باغ و چمن پیش نظر، بزم طرب شام و سحر
ہر سو بکثرت جلوہ گر حسن بتان نازنیں

ایک آسمان کے دور سے اک گردش فی‌الفور سے
اب سوچیے گا غور سے در لحظہ آں در لحظہ ایں

سنتے ہی جی تھرا گیا، رخسار پر اشک آ گیا
دل عبرتوں سے چھا گیا، خاطر ہوئی بس سہمگیں

اس میں سر اپنا ناگہاں ہر مو ہوا مثل زباں
بولا نظیر آگہ ہو ہاں، من نیز روزے ہمچنیں

ارے دل تجھے لے چلے حسن والے
کہوں اور کیا، جا خدا کے حوالے

ادھر آ ذرا تجھ سے ملکر میں رو لوں
تو مجھ سے ذرا مل کے آنسو بہالے

چلا اب تو ساتھ ان کے تو بے بسی سے
لگا میرے پہلو میں فرقت کے بھالے

خبردار ان کے سوا زلف و رخ کے
کہیں مت نکلنا اندھیرے اُجالے

ترے اور بھی ہیں طلب گار کتنے
مبادا کوئی تجھ کو واں سے اُڑالے

کہیں قہر ایسا نہ کیجو کہ مجھکو
بلانے پڑیں فال تعویذ والے

کسی کا تو کچھ بھی نہ جاوے گا لیکن
پڑیں گے مجھے اپنے جینے کے لالے

تری کچھ سفارش میں ان سے بھی کردوں
کرے گا تو کیا یاد مجھ کو بھلالے

سنو دلبرو! گلرخو! مہ جبینو!
میں تم پاس آیا ہوں اک التجا لے

خدا کی رضا یا محبت سے اپنی
پڑا اب تو آکر تمہارے یہ پالے

تم اپنے ہی قدموں تلے اس کو رکھیو
تسلی دلاسے میں ہر دم سنبھالے

کبھی اس کو تکلیف ایسی نہ دیجو
کہ غم میں یہ رہ کر کرے آہ و نالے

تمہارے یہ سب ناز اٹھاوے گا لیکن
وہی بوجھ رکھیو جسے یہ اٹھالے

نظیر آہ دل کی جدائی بری ہے
بہیں کیوں نہ آنکھوں سے آنسو کے نالے

اگر دسترس ہو تو کیجے منادی
کہ پھر کوئی سینے میں دل کو نہ پالے

اب دیکھیں پھر ہم اے ہمدم کس روز منھ اس کا دیکھیں گے
وہ زلف وہ تل وہ خال وہ خد وہ رنگ وہ نقشا دیکھیں گے

جب پاس صنم کے بیٹھیں گے خوش ہو کے اس کے لطف سے ہم
وہ بزم وہ خط وہ عیش وہ مئے وہ جام وہ مینا دیکھیں گے

———

مجبور ہو ہم اس کی یوں انجمن سے نکلے
جیسے قفس میں پڑ کر بلبل چمن سے نکلے

دل دے کے شمع رو، کے کوچے سے کب اٹھیں ہم
پروانہ پر جلا کر کیونکر لگن سے نکلے

سحر نگہ کے ہمرہ پہلو سے یوں چلا دل
جیسے کوئی ہو بے بس اپنے وطن سے نکلے

———

نہ سرخی غنچۂ گل میں ترے دھن کی سی
نہ یاسمن میں صفائی ترے بدن کی سی

میں کیوں نہ پھولوں، کہ اس گلبدن کے آنے سے
بہار آج مرے گھر میں ہے چمن کی سی

یہ برق ابر میں دیکھے سے یاد آتی ہے
جھلک کسی کے دوپٹے میں نو رتن کی سی

گلوں کے رنگ کو کیا دیکھتے ہو اے خوباں
یہ رنگتیں ہیں تمہارے ہی پیراھن کی سی

تو اپنے تن کو نہ دے نسترن سے اب تشبیہ
بھلا، تو دیکھ یہ نرمی ہے تیرے تن کی سی

———

نہیں ہوا میں یہ بو نافۂ ختن کی سی
لپٹ ہے یہ تو کسی زلف پر شکن کی سی

میں ہنس کے اس لیے منہ چومتا ہوں غنچے کا
کہ کچھ نشانی ہے اس میں ترے دھن کی سی

خدا کے واسطے گل کو نہ میرے ہاتھ سے لو
مجھے بو آتی ہے اس میں کسی بدن کی سی

ہزار تن کے چلیں بانکے خوبرو، لیکن
کسی میں آن نہیں تیرے بانکپن کی سی

———

ہم دیکھیں کس دن حسن اے دل اس رشک پری کا دیکھیں گے
وہ قد وہ کمر وہ چشم وہ لب وہ زلف وہ مکھڑا دیکھیں گے

مت دیکھ بتوں کی ابرو کو ہٹ یاں سے تو اے دل ورنہ تجھے
ایک آن میں بسمل کردیں گے اور آپ تماشا دیکھیں گے

دل دے کر ہم نے آج اسے ہی دیکھی صورت تیوری کی
یہ شکل رہی تو اے ہمدم کل دیکھیں کیا کیا دیکھیں گے

جب دیکھی اس کی چیں جبیں یوں ہم نے نظیرؔ اس بت سے کہا
خیر آپ تو ہم سے نا خوش ہیں اب اور کو ہم جا دیکھیں گے

کیا لطف رہا اس چاہت میں جو ہم چاہیں اور تم ہو خفا
یہ بات سنی تو وہ چنچل یوں ہنس کر بولا دیکھیں گے

———

وہ جب گھر سے نکلا سچکتے سچکتے قدم بھی اٹھائے جھجھکتے جھجھکتے

———

تاب اس کے دیکھنے کی نہ لائے چلے گئے
کیا کیا پری جواں تھے آئے چلے گئے

آدم رہا نہ کوئی پیمبر رہا یہاں
وہ بھی سر زمیں میں سمائے چلے گئے

دارا رہا نہ جم نہ سکندر سا بادشاہ
تخت زمیں پہ سیکڑوں آئے چلے گئے

عالم تھا یہ زلیخا کا یوسف کی چاہ میں
رقعے ہزار بیاہ کے آئے چلے گئے

دیکھا نظیر میں نے چمن میں جو آپ کو
مہندی بھرے جو ہاتھ دکھائے چلے گئے

تن پر اس کے سیم فدا اور منھ پر مہ دیوانہ ہے
سر سے لےکر پاؤں تلک اک موتی کا سا دانہ ہے

بانکی سج دھج آن انوٹھی بھولی صورت شوخ مزاج
نظروں میں کھل کھیل لگاوٹ آنکھوں میں شرمانا ہے

تن بھی کچھ گدرایا ہے اور قد بھی بڑھتا آتا ہے
کچھ کچھ حسن تو آیا ہے اور کچھ کچھ اور بھی آنا ہے

جو دیکھی بالیدگی میں ہردم بہار حسن نگار ہم نے
تو ویسی بڑھتی کبھی نہ دیکھی کسی چمن کی بہار ہم نے

ادائیں غمزے کی ہیں جتاتی کہ فی الحقیقت اگر کسی نے
رکھا ہے دل طاق آسماں پر لیا ہے واں سے اتار ہم نے

قدم وہ گن گن ادا سے رکھنا کچھ اور مطلب نہیں مگر ہاں
غرض ہے گن گن کے دل کچلنا ، کیا جو دل میں شمار ہم نے

دریا و کوہ و دشت و ہوا ارض اور سما
دیکھا تو ہر مکاں میں وہی ہے رہا سما

ہے کون سی وہ چشم نہیں جس میں اس کا نور
ہے کون سا وہ دل کہ نہیں جس میں اسکی جا

قمری اسی کی یاد میں کوکو کرے ہے یار
بلبل اسی کے شوق میں کرتی ہے چہچہا

مفلس کہیں غریب تونگر کہیں غنی
عاجز کہیں نبل کہیں سلطان کہیں گدا

بھروپ سا بنا کے ہر اک جا وہ آن آن
کس کس طرح کے روپ بدلتا ہے واہ وا

ملک رضا میں لے کے توکل کی جنس کو
بیٹھیں ہیں سب اسی کی دکانیں لگا لگا

سب کا اسی دکان سے جاری ہے کاروبار
لیتا ہے کوئی حسن کوئی دل ہے بیچتا

دیکھا جو خوب غور سے ہم نے تو یاں نظیر
بازار مصطفیٰ ہے خریدار ہے خدا

لالے کو گو کہ لال کا پیالا بنادیا
پر ساتھ اس کے داغ بھی کیسا لگا دیا

گردوں نے ہم کو کیا نہ دیا اور کیا دیا
سب کچھ دیا اگر دل بے مدعا دیا

لے گل سے تا بہ خار مرے دل کے باغ کو
اس شعلہ رو نے ایک نظر میں جلا دیا

اے ابر تر ہمارے بھی ابر مژہ نے آج
پل مارنے میں اشک کا دریا بہا دیا

خواب عدم میں ہم تو فراغت سے اے نظیر
سوتے تھے لیکن عشق نے آکر جگا دیا

بہار آئی کیا ہر شاخ پر گل نے مکاں اپنا
بنا اب تو بھی اے بلبل چمن میں آشیاں اپنا

مقابل اس کے منہ کے گل کو تو کس منہ سے کرتا ہے
کہاں گل اور کہاں وہ منہ تو دیکھ اے باغباں اپنا

عدم سے جو ہمیں اے ہمنشیں ہستی میں لایا ہے
وہی غمخوار اپنا، یار اپنا، مہرباں اپنا

دل یار کی گلی میں کر آرام رہ گیا
پایا جہاں فقیر نے بسرام رہ گیا
کس کس نے اس کے عشق میں مارا نہ دم ولے
سب چل بسے مگر وہ دل آرام رہ گیا

ہیں دم کے ساتھ عشرت و عسرت ہزارہا
وابستہ ایک تار نفس سے ہیں تارہا
کچھ صید زخم خوردۂ جاناں ہمیں نہیں
ہر صیدگہ میں اس کی ہیں بسمل شکارہا
آیا وہ جب تو ہم نہ رہے آپ میں غرض
دیکھا اسی طرح سے، آسے ہم نے بارہا
اس گل کے چاک جیب کی حسرت سے باغ میں
ہر صبح چاک ہوتی ہیں جیب و کنارہا
کس کس کی دیکھیے چمن صنع میں بہار
اپنی فقط دو چشم ہیں اور یاں بہارہا
تھے کل یہ شاہدان سہی‌سرو و سیم‌تن
شاہد ہیں آج مرگ کے جن کے مزارہا

یار نے ہم کو اگر رسوا کہا اچھا کہا
ہم تو رسوا ہیں ہی کیا بےجا کہا اچھا کہا

وہ رشک حور جو وقت سحر بے نقاب تھا
دیکھ اس کے رخ کو رو بہ زمیں آفتاب تھا

ق

اک دن، دل اپنا، عیش گذشتہ کو یاد کر
رہ رہ کے ہم سے مانگتا اس کا جواب تھا

یعنی وہ کیا زمانۂ عشرت تھا اے نظیر
جس میں ہزار عیش سے میں کامیاب تھا

اب زار و ناتواں و ضعیف و نحیف ہوں
نقش طلسم تھا وہ کوئی یا حباب تھا

اک جنبش مژہ میں وہ برہم ہوا طلسم
کیا کہئے اس کو اور مگر یہ کہ خواب تھا

جب ہم نے دل سے بھر کے دم سرد یوں کہا
جس میں مئے طرب سے تو مست و خراب تھا

ھیہات کیا بتائیں ہم اس عصر خوش کا نام
اے غفلت انتہا وھی عہد شباب تھا

مے پی کے جو گرتا ہے تو لیتے ہیں آسے تھام
نظروں سے گرا جو اسے پھر کس نے سنبھالا

ساقی شراب ہے تو غنیمت ہے اب کی اب
پھر بزم ہوگی جب تو سمجھ لیجو جب کی جب

ساغر کے لب سے پوچھیے اس لب کی لذتیں
کس واسطے کہ خوب سمجھتا ہے لب کی لب

کم فرصتی سے عمر کی اپنی ہزار حیف
جتنی تھیں خواہشیں وہ رہیں دل میں سب کی سب

سن کر وہ کل کی، آج نہ ہو، کس طرح خفا
اے نا شناس طبع، کبھی تو نے کب کی کب

یوں جھمکتا ہے رخ اس محبوب کا زیر نقاب
ہو نمایاں جس طرح ابرتنک میں آفتاب

———

کچھ اسے شرم کچھ ہے ہم کو حجاب
ہے نئی چاہ میں یہ طرفہ عذاب

———

سحر ہم نے چمن اندر عجب دیکھا گل اک دلبر
سہی قامت پری پیکر، مقطع وضع خوش منظر
سخن بر غنچہ لب گل رو، جبیں سہر اور کماں ابرو
دو چشم شوخ پر جادو نگہ تیر اور مژہ نشتر

شمیم زلف مشک افشاں تغافل سو ستم ساماں
غرور اور ناز بے پایاں مزاج اور طبع نازک تر
ادائیں سب فسوں آئیں نہ چھوڑیں دل نہ چھوڑیں دیں
فریب و عشوہ صلح آگیں عتاب و غمزہ جنگ آور

یہ دیکھا ہم نے جب عالم تو رکھ دل ہاتھ پر ہمدم
کہا ہیں نذر کرتے ہم جو لے لیجیے تو ہے بہتر
کہا لے جا تو اپنا دل کہ تو کیا اور تیرا دل
نہ لیویں ہم تو ایسا دل، کہا جب ہم نے دوں ہنس کر

ق

یہی اک دل ہے بیچارہ بھلا ہے یا کہ ناکارہ
اگرچہ ہے یہ آوارہ ولیکن ہے وفا پرور
جو نا منظور کرتے ہو تو کردو یہ کب اٹھتا ہے
ہے جب تک دم میں دم اسکے رہے گا یہ اسی در پر

نظیر اس نے سنایہ جب تو بولا یوں وہ شیریں لب
ہمارا ہو چکا یہ اب، بس اس قصے کو کوتہ کر

———

ہم میں بھی اور انہوں میں پہلے جو یاریاں تھیں
دونوں دلوں میں کیا کیا امیدواریاں تھیں

وہ منتظر کہ آویں ہم ہر تپش کہ جاویں
اس ڈھب کی ہر دو جانب بے اختیاریاں تھیں

نہ ضبط ہے نگہ کا نہ رک سکے نظارہ
کیا شوق ورزیاں تھیں کیا بے قراریاں تھیں

اٹھنے میں بیٹھنے میں، ہنسنے میں بولنے میں
کچھ بے شعوریاں تھیں، کچھ ہوشیاریاں تھیں

جس جا نظیر آکر ہوتی ہیں الفتیں تو
واں ایسی ایسی کتنی عشرت شعاریاں تھیں

جو تم نے پوچھا تو حرف الفت بر آیا صاحب ہمارے لب سے
سو اس کو سن کر ہوے خفا تم نہ کہتے تھے ہم اسی سبب سے

نہ دیتے ہم تو کبھی دل اپنا نہ ہوتے ہرگز خراب و رسوا
ولے کریں کیا کہ تم نے ہم کو دکھائیں جھمکیں عجب ہی چھب سے

وہ جعد مشکیں جو دن کو دیکھے تو یاد اس کی میں شام ہی سے
یہ پیچ و تاب آ کے دل سے الجھے کہ پھر سحر تک نہ سلجھے شب سے

لگائی فندق جو ہم نے اس کی کلائی پکڑی تو ہنس کے بولا
یہ انگلی پہنچے کی یاں نہ ٹھہری بس آپ رہئیے ذرا ادب سے

کہا تھا ہم کچھ کہیں گے تم سے کہا تو ایسا کہ ہم نہ سمجھے
سمجھتے کیونکر کہ اس نے لب سے سخن نکالا کچھ ایسے ڈھب سے

ہوس تو بوسے کی ہے نہایت پہ کیجیے کیا کہ بس نہیں ہے
جو دست رس ہو تو مثل ساغر لگاویں لب کو ہم ان کے لب سے

کسی نے پوچھا نظیر کو بھی تمہاری محفل میں بار ہوگا
کہا کہ ہوگا، وہ بولا، کب سے کہا کبھو کا کبھی، نہ اب سے

یہ جو اٹھتی کونپل ہے جب اپنا برگ نکالے گی
ڈالی ڈالی چاٹے گی اور پتا پتا کھالے گی

ہونہار بروا کے پتے چکنے چکنے ہوتے ہیں
بہت نہیں کچھ تھوڑے ہی دن میں بیل پھنگ کو آلے گی

ابھی تو کیا ہے چھٹپن ہے نادانی ہے بیہوشی ہے
پھر تو اس دن ہوویگا جب اپنا ہوش سنبھالے گی

ناز ادا اور غمزوں کے کچھ اور ہی کترے گی گل پھول
سین لگاوٹ چتوں کا بھی اور ہی عضر نکالے گی

کاجل مہندی پان مسی اور کنگھی چوٹی میں ہر آن
کیا کیا رنگ بناوے گی اور کیا کیا نقشے ڈھالے گی

جب یہ تن گدراوے گا اور بازو باہیں ہوں گے گول
اس دم دیکھا چاھئیے کیا کیا بیٹ کے پاؤں نکالے گی

پان چبا اور آئینے میں دیکھ کے اپنے ہونٹوں کو
کیا کیا ھنس ھنس دیوے گی اور کیا کیا دیکھے بھالے گی

خانہ جنگیاں ہوویں گی اور لوگ مریں گے کٹ کٹ کر
شہر کے کوچے گلیوں میں اک شور قیامت ڈالے گی

سونا روپا سیم و جواھر صبر و دل و دین ہوش و قرار
آنکھ اٹھا کر دیکھتے ھی ایک آن میں سب رکھوا لے گی

ا
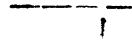
کل دیکھ کے اس کے عالم کو اک عالم کے اوسان گئے
واللہ عجب کچھ عالم تھا جو جان گئے سو جان گئے

کیا حسن کہوں اللہ رے حسن اس رشک پری کی صورت پر
انسان رہے کس گنتی میں جب حور و ملک قربان گئے

اس مکھڑے چاند کے ٹکڑے کو تر دیکھ عرق کے قطروں سے
کتنوں کے دین پھرے بہتے اور کتنوں کے ایمان گئے

تھے چین جبیں پر ایسے ہی اُس رشک بت چیں کے جس سے
جو کافر کٹے چین کے تھے وہ کافر بھی چیں مان گئے

وہ بوند سیاہی مژگاں کی جب آتری تیر اندازی پر
دل چھید جگر سوراخ کیا اور سینہ تو سب چھان گئے

کچھ بھیس بدل کر شب کو ہم جوں پہونچے اسکی مجلس میں
وہ کافر وو ہیں بول اُٹھا ہم جان گئے ہم جان گئے

جب میں نے نظیر اُس سے یہ کہا، اب غم کھائے کیا ہوتا ہے
ان باتوں کو مت یاد کرو وہ پانی بہہ ملتان گئے

ختم شد

*****